خطیبِ آلِ محمدؐ

مولانا خطیب ظفر حسن زیدی اعلی اللہ مقامہ کی تقاریر کا مجموعہ

حصہ چہارم

مرتب
ظفر عباس سعید
ایم اے

پاک کتب خانہ، اردو بازار، راولپنڈی

سلسلہ مجمع نشر السیر

(جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں)

مجموعۂ تقاریر

(حضرت مولانا السید اظہر حسن زیدی مدظلہ العالی)

خطیبِ آلِ محمدؐ

حصہ چہارم

مُرتّب

خضر عباس سید

ناشران: پاک کتب خانہ اردو بازار راولپنڈی

۳

حسینؑ!

تُو نے دُنیا میں ایک ایسا باغ لگا دیا ہے جسکے

پھل

انسانیت کو ہمیشہ ملتے رہیں گے۔ اور جسکے درختوں کے

زیرِ سایہ ستائی ہوئی **انسانیت** ہمیشہ

پناہ

لیتی رہے گی۔

خطیبِ آلِ محمد

پیش لفظ

حکومت پاکستان کی طرف سے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جا چکا ہے جو یقیناً تحریک ختم نبوت کی ایک ارتقائی منزل ہے۔ مگر اسی کو منزلِ مقصود سمجھ لینا بھی ایک نادانی ہے کیونکہ قادیانیوں نے حکومتی فیصلے کے آگے سرِ تسلیم خم نہیں کیا۔ اور نہ ہی اپنے نظریات تبدیل کرنے پر آمادگی کا اظہار کیا ہے۔ بلکہ اپنے پروگرام کو پہلے سے زیادہ مستقل مزاجی سے جاری رکھ رہے ہیں اور اپنے ہم عقیدہ لوگوں کو جنوری ۱۹۷۵ء کے لئے خوشخبری کی حسبِ معمول پیشین گوئی کر چکے ہیں۔ اب اُن کی یہ پیشین گوئی کیا رنگ لائے گی۔ اس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں البتہ عقلِ انسانی یہ سوچنے پر مجبور ہو چکی ہے کہ قادیانی پاکستان کیلئے اب کسی صورت میں وفاداری کا یقین نہیں دلا سکتے۔ لہٰذا حکومت اور مسلمانوں کو موجودہ حالات میں چوکس رہنے کی ضرورت ہے۔ اور اس بات کی ضرورت ہے کہ ہمارے نوجوان اپنے قول و فعل و عمل سے تحفظ ختم نبوت کی خاطر میدانِ عمل میں اتر آئیں۔

مسلمانوں کے ہر مکتبِ فکر نے اپنی علمی و ادبی بساط کے مطابق تحفظ ختم نبوۃ پر تحریر و تقریر کے ذریعہ نوجوانانِ اسلام کے ذہن کو جھنجھوڑا۔ چنانچہ شیعہ کے جعفری شہر چنیوٹ میں پچیس اگست ۱۹۷۴ء کو ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا گیا۔ جس میں خطیبِ آلِ محمد نے تحفظ ختم نبوۃ کے موضوع پر اہلِ علم حضرات کو دعوتِ فکر دی۔

خطیبِ آلِ محمد حصہ چہارم کا آغاز تحفظ ختم نبوۃ کی شہرۂ آفاق تقریر سے کیا گیا ہے جو اپنے موضوع اور بیان کے اعتبار سے منفرد مقام رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ عقد سیدہ، اضافہ شکریہ اور قانونِ عدل جیسی فلسفیانہ تقاریر میں مولانا موصوف نے نہایت چابک دستی کے ساتھ سلاست و سادگی کی

زبان دبستان کی ہے۔ گویا زبان کی پاکیزگی اور بیان میں جدت مولانا کی فن تقریر کا خاص جوہر ہے۔ پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلہ نہایت سلیس زبان میں حل کیا گیا ہے تاکہ قاری کا ذہن منتشر نہ ہونے پائے۔ کہیں کہیں شوخی و ظرافت نظر آتی ہے مگر سنجیدگی اور متانت کا دامن چھوٹتا دکھائی نہیں دیتا۔ موصوف نے اپنی ان تقریروں میں ہر طبقہ فکر اور ہر سن کے سامعین سے خطاب فرمایا ہے۔ اس لئے جب بھی کوئی نئی بات کہنا چاہتے ہیں تو سامعین کی مراد اور مزاج کے مطابق گفتگو کرتے ہیں مثلاً اگر کسی فلسفہ و منطق پر گفتگو ہو رہی ہے تو فقیہ علماء سے خطاب کیا گیا ہے اور اگر کہیں لطیفہ یا کہانی سے مراد لینا مقصود ہے تو بچوں سے خطاب کیا جا رہا ہے۔

اور پھر لطف یہ ہے کہ دوران تقریر صرف اپنی ہی بات نہیں کہی جاتی بلکہ سامعین کی زبان سے بھی بات کہلوائی جاتی ہے۔ تاکہ منبر پر کہے ہوئے الفاظ فضا میں گم نہ ہونے پائیں۔ گویا مولانا موصوف کے نزدیک سامعین اور خطیب ایک ہی انسان کے دو نام ہیں جو ایک ہی وقت میں دونوں فرائض سر انجام دیتا ہے۔

قارئین!

نخل خطابت کے تیز درخشاں کی شاخوں کا چوتھا گلدستہ پیش خدمت ہے۔ قبول فرمائیے گا۔

خاک پائے مومنین

خضر عباس سید

۱۰۔ نومبر ۱۹۶۷ء

ترتیبِ مضامین

ختمِ نبوۃ ـــــــ ۶ ـــــــ ★

عقدِ سیّدہ ـــــــ ۳۲ ـــــــ ★

اضافۂ شکریہ ـــــــ ۵۱ ـــــــ ★

قانونِ عدل (۱) ـــــــ ۷۵ ـــــــ ★

قانونِ عدل (۲) ـــــــ ۹۵ ـــــــ ★

محسنِ اعظم ـــــــ ۱۱۹ ـــــــ ★

(جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ) پانچواں ایڈیشن

تعداد ـــــــ ۱۱۰۰

پرنٹر ـــــــ امتیاز فیاض پریس

چوک اردو بازار لاہور

[illegible] ۴۰/- روپیے

خَتمِ نُبُوَّة

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

خداوند عزّ اسمہٗ و جلّ جلالہٗ کی حمد و ثناء کے بعد حضرات محمد و آلِ محمد پر درود و سلام کے

حضرات علمائے کرام و سامعین عظام!

آپ حضرات کے واجب الاتباع حکم کی تعمیل میں آج میں یہاں حاضر ہوا ہوں۔ جب میں یہاں پہنچا تو بڑی روشنی تھی جس کی وجہ سے میں نے آتے ہی جگہ پہچان لی کہ یہ تو ہمارا پنجتانی اڈہ ہے۔ یہاں تو ہم کئی بار آ چکے ہیں۔ پھر مجھے مولانا موصوف مدرسے لے گئے۔ جو میرے لئے بہت بہتر تھا کیونکہ مدرسے کی ہوا لگنے سے مجھ میں اتنی طاقت آگئی کہ میں آپ سے خطاب کر سکوں۔ پھر فوراً میں یہاں پہنچا اور یہاں آکر میں نے دیکھا کہ ہر مکتب فکر، ہر طرز، ہر سن کا انسان یہاں موجود ہے۔ گویا یہاں مکاتب فقہ بھی ہیں اور مکاتب فکر بھی ہیں۔ یہاں انگریزی مدرسوں کے طالب علم بھی ہیں، اور عربی مدرسوں کے طالب علم بھی ہیں۔ لہٰذا جب اتنی جماعتیں مل کے بیٹھ جائیں تو ان کا مل بیٹھنا ہی بہت بڑی خوشی کی بات ہے۔ چنانچہ اس خوشی کے موقع کو دیکھ کر کسی کے دل سے یہ دعا نکل کر ؎

خوشی کا وقت ہے گل کر دو ان چراغوں کو
خوشی کے وقت ہے کیا کام جلنے والوں کا

حضور والا! اسی اجتماع کی خوشی میں ہم نے گل کر دیا۔ خداوندا! ہمیں بجلی نہیں چاہئے۔ بجلی وہاں گرا جہاں اسے گرنا چاہئے اس لئے کہ بجلی کی روشنی انسانوں کی بنائی ہوئی روشنی ہے۔ اور ہم تو یہاں آگئے ہی اس لئے ہوئے ہیں

جو انسانوں کی بنائی ہوئی مصنوعی روشنیوں کو بجھا دیں۔

بزرگانِ من!

بوجہ علالت تقریباً ڈیڑھ ماہ تک مجھے ہسپتال میں داخل رہنا پڑا۔ اخبار میں پڑھ سکتا نہیں تھا۔ یوں ہی لیٹے لیٹے پڑھوا لیا کرتا تھا۔

• بچو! بتاؤ ملک کی کیا حالت ہے۔ سیاسی حالات کیا ہیں۔ مذہبی حالات کیا ہیں۔ ابھی ابھی ہمارے ملک میں دنیا بھر کے اسلامی سربراہوں کی کانفرنس ہوئی ہے جس میں عالمِ اسلام کا کیا حال ہے۔ وہاں مسلمانوں کی کیا کیفیت ہے! چنانچہ بچے پڑھ پڑھ کر مجھے سناتے اور میں بہت خوش ہوتا کہ مسلمانوں کا بڑا اچھا حال ہے ہمارا کاروان بڑی اچھی طرح چل رہا ہے۔ ہمارا قافلہ بڑی شان سے رواں دواں ہے۔ ایک دن اسی دوران میں نے سنا کہ ہمارا کارواں جب بڑی شان سے چل رہا تھا تو کسی بدنظر نے ہماری "چلتی گاڑی" کو روکنا چاہا کیونکہ وہ چاہتا نہیں تھا کہ مسلمانوں کی گاڑی چلتی رہے۔ میرے پاس اور تو کچھ تھا نہیں۔ لیٹے ہی لیٹے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔

• خداوندا! وہ لوگ جو ہماری چلتی گاڑی کو روکنا چاہیں، اُن سے [illegible] واسطہ نہ پڑے۔ اُن سے ہمارا کبھی واسطہ نہ ہو۔ اُن سے ہمارا کبھی تعلق نہ ہو۔

بہرحال یہ واقعہ بھی پیش آیا اور اس کے بعد اور خبریں بھی سنتا رہا۔

محترم سامعین!

مجھے آج اس مختصر سے وقت میں ڈکسن کی نبوت پر تنقید کرنی ہے اور نہ ہی کسی شخصیت پر تنقید کرنی ہے۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھے۔

• زبیدی صاحب!

• فلاں شخص نبی بن گئے۔

میں کہتا ہوں: بس تجھے تو میں کیا کروں - میں نے دُنیا کے سارے پاگلوں کی فہرست تو نہیں بنا رکھی کہ تم بھی شمار کئے ہیں یا نہیں۔ تنقید کرتا رہوں۔ میں نے تو آج اپنا عقیدہ بیان کرنا ہے۔ دینِ اسلام کی بات کہنی ہے:

یاد رکھو!

اللہ کا ہم پر بہت بڑا فضل و کرم ہے کہ اس نے ہمیں انسان بنایا ہے۔ اور انسان بنا کر ہمیں اس دُنیا میں بھیج دیا، ہم چلے آئے۔

پھوپی جانو! ... کوئی ہے ایسا انسان جو اپنی مرضی سے آیا ہو!

ہرگز نہیں۔

دیکھو نا! اگر ہم اپنی خوشی سے آتے تو آتے ہی ہنستے۔ مگر ہم تو آتے ہی روئے تھے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ یہاں آنے کو ضرور جی نہیں چاہتا تھا۔ اللہ نے ہمیں زبردستی بھیج دیا ہم آ گئے اور جب تک یہاں رکھے گا ہمیں رہنا پڑے گا۔ اور جس دن بلائے گا جانا ضرور ہی ہمیں جانا پڑے گا۔ یہ اور بات ہے کہ اپنے پیروں سے چل کر نہیں جائیں گے تو چار بندے اٹھا کے لے جائیں گے مگر جانا ضرور پڑے گا۔

کتنا بے بس ہے انسان کہ نہ آنے میں بس ہے اور نہ جانے میں بس ہے وہی یہاں رہنے میں بس ہے۔ اللہ جانے ہم یہاں آ کر کیا جرم کر بیٹھے ہیں کہ اس دُنیا میں آ کر چاہے ہم ایک سانس لیں چاہے ہزاروں لاکھوں سانس لیں مگر یہاں جینا آنا اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کی سزا **موت** ہے۔ کیا مجال جو کوئی شخص سزائے موت سے بچ جائے۔ آخر ہم بھی پیدا ہوئے ہیں۔

پھپھو! اگر نہ روتے؟

تو یہ جا۔ خود سے تو کبھی نہ آتے۔ چونکہ تو نے بھیجا ہے۔ اس لئے پوچھتے ہیں کہ جب تو نے ہی ہمیں بھیجا ہے تو یہاں ہمارے آنے کا مقصد کیا ہے؟

حضورِ والا!

خدا گواہ ہے۔ ہمیں بھی بڑی شان و شوکت سے دماغ کے فانوس میں عقل کی شمع روشن کرکے بھیجا۔ دانتوں کے کٹہرے میں زبان کو بولنے کی طاقت میں پابند کرکے بھیجا۔ آنکھوں میں دو سے چراغ روشن کرکے بھیجا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت دیکے بھیجا۔ زمین پھیل جائیں تو جال بن جائیں اور چاند پہ پہنچ جائیں تو کمندیں بن جائیں۔ ستارے ہمارے تابع۔ سورج ہمارے تابع۔ چاند ہمارے تابع۔ آسمان ہمارے تابع۔ زمین ہمارے تابع۔ اور آج ہم زمین سے فارغ ہوکر آسمان پہ جانے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ اور فرشتوں میں کھلبلی مچی ہوئی ہے کہ جنت سے نکالا ہوا پھر واپس آرہا ہے۔ گویا خدا نے اس شان سے ہمیں بھیجا۔ ہماری طاقت کا کوئی اندازہ نہیں کرسکتا۔ ہماری قوت کا کوئی اندازہ نہیں کرسکتا۔

سمجھو!

سینکڑوں دفعہ یہ بات تمہیں بتا چکا ہوں کہ یہ ہماری طاقت کی حد ہے کہ ہم یہاں بیٹھ کر امریکہ، روس اور لندن کی باتیں سنتے ہیں اور سننے کا انداز یہ ہوتا ہے کہ سامنے ایک صندوق رکھ لیا۔ ہم سننے بیٹھ گئے اور صندوق سے بہت دور کی سی بات۔ اور پھر لطف یہ ہے کہ اس کے سامنے ہم نہیں جوڑتے بلکہ تمام سے اس کے کان مروڑتے ہیں۔ اور وہ ہمارے سامنے باتیں کرنے لگ جاتا ہے۔

اب بتاؤ: جب ہم یہاں بیٹھ کر پوری دنیا کی باتیں سن سکتے ہیں۔ اب اگر ہم اس کا نام "وحی" رکھ دیں تو کسی کو کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ بس اگر نام ہی رکھنا ہے تو آپ اسے ریڈیو کہیں اور ہم اسے "وحی"۔ یہی فرشتہ کہہ دوں گا۔ مجھے بڑی آسانی سے میں بھی نبی بن گیا۔

سامعین! - اگر آپ میرے ساتھ تعاون کریں تو آج میں نبوت کا

دوسی تارورڈ! ——— بچو! کیا ارادہ ہے؟

دیکھو نا! اگر تم تھوڑی دیر کے لئے میری بات میں ہاں ملا دو تو میں بھی بآسانی نبی بن سکتا ہوں، کیونکہ نبی کی جو شرطیں ہیں وہ تقریباً پوری ہیں

مثلاً آنکھوں سے نظر نہیں آتا، آنکھوں کے لئے عینک چاہیئے دانت مصنوعی ہیں، چھڑی کے بغیر چل نہیں سکتا، بغیر سہارے کے کام نہیں ہوتا، دوسرے کی عقل سے سوچتا ہوں گویا جب اپنے حواس ختم ہو جائیں، اپنی عقل ختم ہو جائے تو آدمی کے بعد نبی بن جاؤ۔ جھگڑا اس بات کا ہے اور مصیبت یہ ہے کہ جوڑوں میں بیماریاں لگ جائیں مگر نام "مسیحا" ہو۔

بچو! تم نے پھر مردہ شست "مردہ باد" کا نعرہ بلند کیا۔
میں کہتا ہوں "مردہ باد" نہ کہا کرو۔ اس لئے کہ "مردہ باد" تو
ہوتا ہے جو پہلے "زندہ" ہو اور جو پہلے ہی سے زندہ نہ ہو وہ
"مردہ باد" کیسے کہلائے گا

پھر خدا میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اللہ نے انسان کو بہت سی طاقتیں دے کر بھیجا ہے آخر ہم نے عرض کی: خداوندا! تو نے اتنی طاقتیں دے کر ہمیں بھیجا ہے آخر ہمارے آنے کا مقصد کیا ہے؟

اللہ جواب میں فرماتا ہے:

دیکھو نا! ہم نے تمہیں دنیا میں کھانے پینے کے لئے نہیں بھیجا بلکہ تمہارے سر میں بھیجے ہیں، عقل ہے تو ہمارے بھیجے کا مقصد سمجھو اور وہ ہے کہ ہم نے تمہیں "عبادت" کے لئے بھیجا ہے۔

صاحبان!

میرے قریب بیٹھے ہوئے یہ نوجوان بچے مجھے گھور رہے ہیں کہ

• زیدی صاحب ! کہدی نا آخر مولویوں والی بات ۔

میں کہتا ہوں ۔ بچو ! آخر مولویوں والی بات سے چھٹکارا تو نہیں مل سکتا ۔ حقیقی بات تو یہی ہے کہ اللہ نے انسان کو عبادت کے لئے پیدا کیا ہے ۔ خواہ تم اسے صحیح سمجھو یا غلط جانو ۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عبادت کیا شے ہے ؟

سامعین !

حضرات علمائے کرام یہاں پر تشریف فرما ہیں ۔ یہ حضرات مجھ جاہل آدمی کی اس بات کی تصدیق کریں گے کہ " عبادت " کا مفہوم اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے کہ

عبادت ہر اس عمل کو کہتے ہیں جس سے اللہ خوش ہو جائے

گویا جس کام سے اللہ خوش ہو جائے وہ عبادت ہے ۔ اگر اللہ نماز پڑھنے سے خوش ہے تو یقیناً نماز عبادت ہے ۔ اگر خدا روزہ رکھنے سے خوش ہے تو روزہ عبادت ہے ۔ روزہ بذات خود عبادت نہیں چونکہ اللہ خوش ہے اس لئے عبادت ہے اور نماز بھی اس لئے عبادت کہ اللہ خوش ہے ۔ گویا ہر وہ عمل جس سے اللہ خوش ہو جائے وہ عبادت ہے ۔

پڑھے لکھے نوجوانو !

اب یہ بتاؤ کہ جب عبادت کرنی ہے میں نے اور خوش کرنا ہے اللہ کو تو اب مجھے کیسے پتہ چلے کہ میرے اس عمل سے اللہ خوش بھی ہے یا نہیں ۔ ہو سکتا ہے میں یہ سمجھوں کہ اللہ بڑا خوش ہے اور وہ ناراض بیٹھا ہو ۔ تو کیسے پتہ چلے کہ اللہ خوش بھی ہے یا نہیں ۔ تو اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ ہم خود اللہ سے پوچھ آئیں کہ تو خوش بھی ہے یا نہیں ؟

اب بتاؤ ! تم میں سے کون اللہ کے گھر جانے کو تیار ہے ؟

دیکھنا! کسی کو زبردستی بھیج دیں تو وہ واپس نہیں آتا اور جو کہتے ہیں کہ اللہ وحشی ہے تو انہوں نے ابھی تک اللہ سے ملاقات ہی نہیں کی۔ تو کیسے جانیں کہ اللہ ہمارے اعمال سے خوش ہے یا نہیں۔ کیونکہ جس کی پسند کا کام کرنا ہے وہ پردہ نشین ہے اور جنہوں نے کام کرنا ہے وہ نامحرم ہیں۔ نامحرم وہاں تک جا نہیں سکتا اور پردہ نشین تک آ نہیں سکتا۔ بس اب پتہ کیسے چلے کہ ہمارے عمل سے وہ پردہ نشین معبود خوش ہے یا نہیں!

حضور والا!

یہ کوئی فلسفے کی بات نہیں کوئی اُلجھا ہوا مسئلہ نہیں۔ سیدھی سادھی بات ہے کہ پردہ نشین کی پسند معلوم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ جس طرح ایک نوجوان نے شادی۔ نوجوان کا عام سی شادی اور بیگم صاحبہ گھر آ گئیں۔ اور آتے ہی دولہا سے فرمائش کر دی کہ میرے لئے سونے کا ایک ہار بنا دو۔ چنانچہ دولہا نے اپنی بستی کے سنار کو گھر بلایا اور کہا:

"میری بیگم کے لئے ایک ہار بنا دو۔"

سنار نے کہا: "حضور! کیسا ہار بناؤں؟"

جوان بولا: "ایسا ہار بنانا جو میری بیگم کو پسند آ جائے۔"

سنار نے کہا: "جناب میں بیگم سے اُن کی پسند پوچھ سکتا ہوں؟"

جوان بولا: "خبردار۔ میری بیگم پردہ نشین ہے: نہ تم وہاں جا سکتے ہو۔ اور نہ ہی وہ باہر آ کر بتا سکتی ہے۔"

آخر ایک عقل مند نے سمجھایا کہ یہ بات تو آسان ہے اگر تم بیگم کی پسند کا ہار بنانا چاہتے ہو تو اس سے کہو کہ وہ اپنی پسند کا ہار بنوانے کے لئے کوئی نمونہ بھیجے چنانچہ بیگم نے ایک نمونہ دے دیا۔ اور سنار اسے لیکر گھر آ گیا۔ اب سنار پہ ضروری ہے کہ

وہ اپنی عقل کو دخل نہ دے۔ بلکہ جو نمونہ اس کو گھر سے آیا ہے بالکل اس کے مطابق عمل کرتے رہیں گے یا جو نمونہ اُدھر سے آیا ہے اسے دیکھتے رہنا اور عمل کرتے رہو مالک اپنا کوئی نمونہ بھیج دیتا۔

دیکھو نا! اس اللہ کو خوش کرنے کے لئے عبادت کرنی ہے تو صرف اسی نمونے کے مطابق کرنا جو اُدھر سے آیا ہے۔ ہو سکتا ہے تمہاری عقل میں کوئی بڑا خوبصورت نمونہ ہو مگر وہ تمہارا اپنا بنایا ہوا ہے۔ جو اس نے بھیجا دیا ہے لہٰذا تم اس نمونہ پر عمل کرنا جو اُدھر سے آیا ہے نہ کہ جو اِدھر سے آیا ہو۔

محترم سامعین!

اللہ نے بھی یہی انتظام فرمایا کہ ہمیں سمجھانے کے لئے، مقصد تخلیق پورا کرنے کیلئے اپنی عبادت کروانے کے لئے ہمارے ایمان کو مستحکم کرنے کے لئے ہمیں مومن بنانے کے لئے اللہ نے ایک نمونہ بھیجا اور نمونے کے ساتھ ساتھ ایک کتاب بھی بھیج دی اور کہا۔

دیکھو! یہ کتاب ہے اور یہ اس کتاب کو لے کر آیا ہے۔ کتاب کو پڑھنا اور کتاب والے کو دیکھنا۔ وہ دونوں مل کے تمہیں بتائیں گے کہ یہ نمونہ ہے اور دیکھو! یہ وہ کتاب ہے جو لاریب فیہ ہے۔ جس میں کوئی شبہ ہی نہیں ہے۔ جس کا نکتہ بھی، جس کا زیر و زبر صحیح۔ جس کا لفظ بھی، جس کا سکون بھی، جس کی حرکت بھی، جس کی حیثیت بھی، جس کا انداز بھی۔ جو شروع سے آخر تک صحیح ہی صحیح ہے حق نے اتارا ہے حق پہ اتارا ہے حق اس کے مضامین ہیں حق اس کے مطالب ہیں۔ حق اس کی تعلیمات ہیں حق اس کے بیانات ہیں۔ حق اس کا خلاصہ ہے حق اس کا پہنچانے والا ہے۔ حق اس پر عمل کرنے والا ہے۔ حق اسے لانے والا ہے۔ لہٰذا کسی کو حق نہیں ہے کہ اسے ناحق کہے۔ ۱

گویا یہ کتاب "لاریب فیہ" ہے۔ جو میں تمہیں بیچ رہا ہوں اعمال "لاریب فیہ"۔ کتاب کو لانے والا بھی "لاعیب فیہ" ہے۔ کتاب میں ریب نہیں، اور پہنچانے والے میں عیب نہیں۔ لہٰذا کسی "عیب دار" کی مجال نہیں جو اس "لاریب فیہ" کتاب کے مالک ہونے کا دعویٰ کرے۔ اللہ پاک بھی فرما رہا ہے کہ اس کتاب کا مصنف میں خود ہوں یہ کتاب میری اپنی تصنیف کردہ ہے میں نے ہی تصنیف کرنے کے بعد اس کتاب کے شائع کرنے کا بھی انتظام کیا تاکہ یہ کتاب چھپ کر دنیا کے سامنے آجائے

سامعین کرام!

سب سے پہلا پریس جس میں اس کتاب کو چھاپنے کا ارادہ تھا اس پریس کا نام تھا آدم پرنٹنگ پریس۔ خدا نے چاہا کہ اپنی کتاب یہاں چھپوا دیں۔ لہٰذا جب آدم پریس میں کتاب چھپنے کی نوبت آئی تو کسی آتش مزاج سے جھگڑا ہو گیا۔ اللہ نے کہا آدم اپنی کتاب یہاں نہیں چھپوائیں گے

چنانچہ کچھ دنوں بعد "نوح پرنٹنگ پریس" قائم ہوا۔ اللہ نے اپنی کتاب یہاں چھپنے کے لئے دی مگر ابھی کتاب کے چھپنے کا ارادہ ہی تھا کہ نوح پریس سیلاب کی زد میں آگیا۔ چنانچہ کسی دوسرے پریس کی تلاش شروع ہو گئی۔ بالآخر ابراہیم پریس بنا۔ خدا نے چاہا کہ اپنی کتاب یہاں چھپوائیں۔ چنانچہ پریس کے پروپرائٹر سے پورا معاہدہ بھی ہو گیا۔ حق اشاعت بھی طے ہو گئے۔ مصنف نے پریس والے کو اپنا "خلیل" بھی بنا لیا۔ جب سارے مرحلے طے ہو گئے مگر جب چھپنے کا وقت آیا تو اللہ جانے پریس والے کی آنکھوں پر کیا پٹی بندھ گئی کہ اعلیٰ حضرت نے اپنی کتاب رکھوا دی کہ یہاں نہیں چھپے گی۔

اس کے بعد "موسیٰ پریس" قائم ہوا۔ کتابت بھی ہو چکی تھی۔ کتاب

بتقریب چھپنے والی تھی کہ جب پتھر پہ چڑھی تو پتھر ہل گیا۔ بہر نوع کتاب یہاں بھی نہ چھپ سکی۔

اس کے بعد جب "چھپنے" پریس" میں کتاب گئی تو پریس والا پریس چھوڑ کر آسمانوں پر چلا گیا۔ گویا اعلیٰ حضرت کی کتاب یہاں بھی نہ چھپ سکی۔

آخر کار مصنف نے کتاب کو اپنے پاس محفوظ رکھا۔ کچھ دن بعد عرب کی خشک آب و ہوا میں "محمد کی پریس" قائم ہو"۔ اللہ نے پریس کے پروپرائٹر سے کہا۔

"محمد! تم نے بھی پریس [illegible]۔ ہماری کتاب چھاپو گے؟"

محمد نے جواب دیا۔۔ ہاں۔ ضرور چھاپیں گے۔

اللہ نے پوچھا "محمد! چھپائی کی اجرت کیا ہوگی؟"

محمد نے کہا۔۔ خداوندا۔ اجرت یہ ہے کہ میرے ساتھ وعدہ کرو کہ اس کتاب کا حق طباعت میرے پاس محفوظ رہے۔ تاکہ میرے بعد کوئی آکر یہ نہ کہے کہ میرے پاس بھی کتاب آتی ہے۔

اللہ نے کہا "محمد! میں راضی ہوں اور کوئی اس کی جسارت نہیں کر سکے گا۔ اگر میرے ہی "غلاموں" میں سے کوئی ایک دے تو میں کیا کروں"

بہر نوع! یہ کتاب "محمد کی پریس" میں چھپی، اور چھپنے کے بعد پریس کے وارث نے پہرہ داری کا پہرہ بٹھا دیا۔ "فما ینطق عن الھویٰ" تاکہ باہر کی بات اندر نہ آنے پائے اور اندر کی بات باہر جانے نہ پائے۔ الغرض کتاب چھپ کر سامنے آگئی اور ہمیں حکم ہوا کہ تم اس کتاب کو پڑھو۔ لہٰذا ہم نے کتاب کو پڑھنا شروع کیا۔ کتاب کے شروع میں لکھا تھا۔ "الذین یومنون بالغیب"

محمد کہتے ہیں! جو ایمان لاتے ہیں

"وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ"

ہر اس شے پر جو تجھ پر نازل کی گئی

"وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ"

اور ہر اس شے پر جو تجھ سے قبل نازل کی گئی

گویا دو چیزوں پر ایمان لاتے ہیں۔ ایک اس چیز پر جو محمد ﷺ پر نازل ہوئی اور ایک اس چیز پر جو محمد ﷺ سے قبل نازل ہوئی۔

علمائے کرام!

خدا آپ کے علم میں ترقی عطا فرمائے۔ آج مجھے غریب کشمیری کی بات بھی سُن لو چونکہ میں حافظ نہیں ہوں۔ ہو سکتا ہے میں نے آیت غلط پڑھ دی ہو۔ خدارا مجھے بتایئے کہ اس سے آگے بھی کچھ ہے؟

مولانا! آخرت کی بات ابھی نہ کیجئے۔ ابھی ایمان کی بات ہو رہی ہے۔ میں پوچھ رہا ہوں کہ اس آیت میں محمد ﷺ پر اور اس سے قبل کے بعد کوئی اور ایمان کی بات ہے؟

ہرگز نہیں۔

کیوں مولانا! اگر خدا یہ بھی کہہ دیتا کہ "مِنْ بَعْدِكَ" تو کیا کتاب کا حجم بڑھ جاتا۔ اسے حفظ کرنے میں کوئی خرابی واقع ہو جاتی!

ہرگز نہیں۔

سامعین!

اگر محمد ﷺ کے بعد کوئی چیز ایمان لانے کے قابل ہے اور اللہ نے نہیں لکھا اور ہم ایمان نہیں لاتے تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔ ہم تو اللہ سے ہی پوچھیں گے۔

خدا وندا۔ معاف کرنا۔ اگر تجھے بعد میں کسی کو بھیجنا تھا تو "مِنْ بَعْدِكَ"

کیوں نہیں بتایا۔ آج ہم صرف تیرے دیکھنے کی وجہ سے نہیں مان رہے۔ اگر تو ہمیں لکھوا، لکھ دیتا تو ہمیں کیا اعتراض تھا۔

بزرگانِ من!

اصولِ دین تین ہیں۔ توحید، نبوت اور قیامت۔

توحید و نبوت پر جاننا "ایمان" ہے اور قیامت پر جاننا "یقین" ہے۔

اور یقین و ایمان میں فرق ہے۔

دیکھو نا! اگر بڑے زور کی بارش ہو رہی ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ آج بارش کیا ہوئی، قیامت ہے۔ اسی طرح کوئٹہ میں جب زلزلہ آیا تو ہم نے کہہ دیا، قیامت آ گئی، حالانکہ قیامت نہیں آئی تھی مگر ہم نے استعارہ کے طور پر قیامت کہہ دیا۔ گویا قیامت کا لفظ ہم استعارہ کے طور پر، تشبیہ کے طور پر، شاعری کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں جس طرح اگر یہاں مولانا احتشام الحق تھانوی تقریر کر رہے ہوں اور جیسا کہ انہوں نے یہاں پڑھنا تھا جو کسی وجہ سے نہ آ سکے، پھر فرض کرو وہ آ جائے۔ وہ یہاں تقریر کرتے تو سامعین بہت لطف اندوز ہوتے۔ اب مولانا موصوف کی تقریر سن کر کیا ہم استعارے کے طور پر، تشبیہ کے طور پر، شاعری کے طور پر یہ کہہ سکتے تھے کہ مولانا موصوف کی تقریر کیا ہے بس، نبوت ہے! ہرگز نہیں۔

معلوم ہوا کہ توحید و نبوت اتنی مستحکم چیز ہے کہ جس کا نام تشبیہ و استعارے کے طور پر بھی نہیں لیا جا سکتا۔ مگر "یقین" وہاں ہے جہاں شاعری کے طور پر لیا جا سکتا ہے۔

پھر فرمایا: اللہ نے کہہ دیا کہ ایمان والے وہ ہیں جو ان چیزوں پر جو اس پر نازل کی گئی ہیں، اور ان چیزوں پر جو اس سے قبل نازل کی گئی ہیں۔ رہ گیا محمد کے بعد...؟ یہاں تمہاری مرضی۔ ہم تو کچھ نہیں کہیں گے۔ تم جانو اور تمہاری مرضی۔

معزز سامعین!

محمدؐ کتاب یہ لے کر آ گئے۔ اور فرمایا کہ اسے پڑھو۔ اسے سمجھو۔ اور کتاب نے بھی اعلان کر دیا کہ دنیا کا کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جو اس کتاب میں نہ ہو اور دیکھو! اس کتاب کے بھیجنے والے نے کہہ دیا کہ دنیا کا کوئی ایسا علم نہیں ہے جو میں تمہیں سب نہ سکھا دوں اور یہ اعلان وہ انسان کر رہا ہے جو اُمّی تھا۔ جس نے پڑھا ہی کچھ نہیں۔

کیوں بچو!

تمہارے رسولؐ نے کسی درس میں پڑھا تھا!   ہرگز نہیں

دیکھو! جمہوریت کا زمانہ ہے۔ ڈر لگتا ہے کہ اگر مذہب کا معاملہ بھی ہو تو پھر بھی جمہور سے پوچھنا پڑتا ہے اگرچہ یہ غلط ہے

سامعین!

میں آج ہی لاہور سے آیا تھا۔ تاکہ میں آپ کے سامنے کچھ بیان کروں۔ اب اگر میں اسٹیج پر کھڑے ہو کر بجائے تقریر کرنے کے اپنی جیب سے ایک کتاب نکال لوں اور پڑھنا شروع کر دوں۔ ادھر لوگ کہتے ہیں۔

"مولانا! تقریر شروع کریں۔"

میں کہتا ہوں "ابھی ٹھہرو"

تھوڑی دیر بعد پھر آواز آئی۔ "زیدی صاحب! شروع کرو!"

میں نے کہا "ٹھہرو بھئی"

جب دس پندرہ منٹ اسی طرح گذر گئے تو تمام مجمع اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور کہنے لگا۔

"زیدی صاحب! اگر یہاں آ کر یہی پڑھنا تھا تو تکلیف کیوں فرمائی۔ ہمیں تو

ایسا مولوی چاہیے جو گھر سے پڑھ کر آیا ہو۔

صاحبان!

جب آپ ایسے مولوی کو برداشت نہیں کر سکتے جو یہاں آ کر پڑھے تو ایسے نبی کو کون برداشت کرے گا جو یہاں آ کر پڑھا ہو۔ لہٰذا ہم تو ایسے نبی کو مانتے ہیں جو یہاں آ کے نہ پڑھے۔ "اُمّی" کہلائے مگر کائنات کا کوئی علم ایسا نہ ہو جس پہ اُسے عبور نہ ہو۔ بہر نوع ہمارا سب پڑھا ہی آ گیا۔ اور اس نے کہا۔

دیکھو! میں پڑھا نہیں مگر سب کو پڑھاؤں گا۔ کوئی ایسا علم نہیں جو میرے علم سے باہر ہو۔ کوئی ایسا مسئلہ نہیں جسے میں نہ جانتا ہوں کوئی ایسی شے نہیں جو مجھے معلوم نہ ہو۔ میں تمہارا ہادی بن کر آیا ہوں۔ تمہیں دین بھی سکھاؤں گا اور تمہیں دنیا بھی سکھاؤں گا۔ کوئی ایسی شے نہیں جو تمہیں بتانے سے رہ جائے لہٰذا تمہیں ہر شے سکھائی جائے گی۔

چنانچہ محمدؐ نے ہمیں ہر شے سکھا دی، ہر شے پڑھا دی۔ بھیجنے والے کی زبان سے کہلوا دیا "اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ" آج کمال ہو گیا۔ آج وہ نعمت جو میری نعمت تھی وہ "تمام" ہو گئی۔

بھائیو! "نعمت" کے "تمام" ہونے کا لفظ بتاتا ہے کہ "نعمت" والی نبوت جو تھی وہ تمام ہو گئی اب کوئی نئی نعمت والی نبوت کہاں سے آئے میں کیا کروں۔

بہر کیف یہ پڑھنے نے ہمیں سب کچھ پڑھا دیا ہے اس کے بعد ہمیں کسی اور نبوت کی ضرورت نہیں۔

دیکھو!
اگر تم ہنسو گے نہیں تو ایک بات سنا دوں!

دیکھو نا! جب میں نے شروع شروع میں مجالس پڑھنا شروع کیں تو ایک دن کسی نے مجھے کہا "قبلہ زیدی صاحب"

میں نے کہا "توبہ کرو۔ میں کیسے قطب بن سکتا ہوں۔ قطب تو علماء ہوتے ہیں لہٰذا مجھے قطب مت کہو۔"

چند دن بعد کسی نے پھر کہا۔ اور میں نے پھر منع کیا۔ چنانچہ تین چار مہینے شروع شروع میں منع کرتا رہا کہ میں قطب نہیں ہوں۔ جب پچاس آدمی مجھے قطب کہنے لگے تو میں چپ ہو گیا۔ اور جب سو دو سو آدمی کہنے لگے تو میں نے کہا۔

"ہو سکتا ہے کہ میں قطب ہی ہوں"

اب مجھے بھی یقین ہو گیا۔ کچھ دن بعد تو یہ حالت بھی ہو گئی کہ اب اگر کوئی قطب نہیں کہتا تو برا لگتا ہے۔

حضور والا!

اس طرح بن جاتا ہے جیسے یہ فرعون و نمرود جیسی مشہور تاریخی شخصیتیں جنھیں آپ فرعون و نمرود کہتے ہیں۔ کیا وہ پاگل تھے۔ کیا انہیں پتہ نہیں تھا کہ ہم خدا نہیں ہیں؟ حالانکہ ان مسخروں کو پتہ تھا کہ ہم خدا نہیں ہیں مگر پاس بیٹھنے والے بیوقوف تھے جو کہتے تھے کہ تم خدا ہو۔ لہٰذا انہوں نے سوچا کہ کیوں نا ان احمقوں سے فائدہ اٹھائیں اور خدا بن جائیں کیونکہ مفت میں بن رہے تھے۔ لہٰذا فرعون و نمرود خدا بن کے بیٹھ گئے۔ اور یاد رکھو! لفظ فرعون و نمرود اس بات کی علامت ہے کہ ایسا شخص جو ایسی بات کا دعویٰ کرے۔ جو اس میں نہیں ہے تو وہ فرعون و نمرود ہوگا چاہے وہ زید ہو یا بکر ہو۔

اور پھر اپنی فرعونیت کو مستحکم کرنے کے لئے فرعون نے بھی اپنے وزیر "ہامان" کو حکم دیا کہ میرے لئے ایک "مینار" تو بنا دو۔

گویا فرعون کی یہ پہچان ہے کہ جب کوئی فرعون بنتا ہے تو اپنے لئے ایک مینار بھی بنواتا ہے تاکہ اس کی پہچان ہو سکے۔ پھر فرعون بن جاتے ہیں جیسے

اب ان سے کوئی پوچھ کیوں بیٹھتے ہو؟ تو وہ جواب میں کہیں گے، وہ لوگ جو بنا
تے ہیں اس لئے ہیں جتنا بٹھے گا۔ ہم نے پوچھا کہ تمہیں معلوم نہیں کہ اس کی سزا
کیا ہے؟

وہ جواب میں کہتے ہیں کہ ہمیں اچھا انجام معلوم ہے کہ دنیا میں تو عیش کریں گے
اور آخرت میں زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ جہنم میں چلے جائیں گے۔

سامعین کرام!

آج ہم خدا کے فضل و کرم سے یہاں بیٹھے ہیں۔ ایک ہی نبی کا کلمہ پڑھتے
ہیں۔ اور جہاں کلمہ پڑھنے کا مطلب یہی ہے کہ لا الٰہ الا اللہ۔ جس طرح خدا کے
بعد کوئی اور خدا ہو سکتا ہے اسی طرح۔ محمد رسول اللہ کے معنی یہی ہیں
کہ محمد کے رسول ہونے کے بعد قیامت تک کوئی دوسرا رسول ہو سکتا ہی نہیں

یاد رکھو!... محمد کے بعد نہ تو ابوبکر نبی ہو سکتا ہے اور نہ ہی
علی نبی ہو سکتے ہیں۔ نہ ہی حسن نبی ہو سکتے ہیں اور نہ ہی حسین نبی ہو سکتے ہیں
ان تمام حضرات کی عزت اسی بات میں ہے کہ وہ ختم نبوۃ کی حفاظت میں مر گئے
ان کی شان اسی بات میں ہے کہ وہ ختم نبوۃ کی حفاظت کرتے رہے

صاحبانِ ذکی!

تاریخ عالم گواہ ہے کہ حضرت ابوبکر کے زمانے میں جب مسیلمہ کذاب
کو قتل کیا گیا تھا تو اتنا قتل و مسلمانوں میں کبھی ہوا ہی نہیں جتنا اس فتنے کے
قتل کے وقت ہوا تھا۔ حالانکہ مسیلمہ کذاب اہلبیت کا ماننے والا تھا صحابہ
کا ماننے والا تھا۔ اور وہ کلمہ بھی یہی پڑھتا تھا لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ
اس کی اذان میں بھی تھی۔ اشہد ان لا الٰہ الا اللہ۔ اشہد ان محمد
رسول اللہ۔ اور ساتھ یہ بھی کہہ دیتا تھا کہ محمد بھی نبی ہیں۔ مگر چھوٹا سا میں بھی

نبی ہوتے ہیں!

بچو! ایک بات بتا دوں کہ منکر وہ ہوتا ہے جو کسی بات سے انکار کر دے اور مشرک وہ ہوتا ہے جو کسی بات میں شریک ہو جائے۔ لہٰذا شرک اور چیز ہے اور منکر اور چیز ہے۔ شرک کرنے والا شریک باری تعالیٰ ہو جاتا ہے اور محمدؐ کی نبوت سے انکار کرنے والا منکر کہلاتا ہے۔ جس طرح مسیلمہ کذاب نے شریک باری تعالیٰ ہونے کے ساتھ ساتھ ختم نبوت سے انکار بھی کیا جس کا جواب اس کے قتل کی شکل میں اہلبیت رسولؐ اور صحابۂ رسولؐ نے دیا۔

سامعین!

یاد رکھو! اگر کسی کے یہ گمان بھی ہوتا کہ محمدؐ کے بعد کوئی اور نبی آسکتا ہے تو محمدؐ کی اتنی مخالفت نہ ہوتی جتنی ہو رہی ہے۔ محمدؐ کی مخالفت جو ان کی اولاد تک جاری رہی اس کا اصل نکتہ یہی ہے کہ اب نبی کوئی نہیں آئے گا۔

علمائے کرام!

آج میں آپ صاحبان کے سامنے علی الاعلان کہتا ہوں کہ اگر یزید کو یہ پتہ ہوتا کہ محمدؐ کے بعد کوئی نبی آسکتا ہے تو وہ اتنے بڑے ساتھ ظلم کا ذمہ دار نہ ہوتا۔ بلکہ خاموش ہو جاتا کہ چلو کوئی بات نہیں پانچ چھ سال بعد نبوت کا دعویٰ کر دوں گا۔ مگر یزید جانتا تھا کہ یہ دعویٰ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اس نے کہا کہ اہلبیت رسولؐ کو قتل کر دو۔

سامعین!

یہ میرے بیان کے آخری فقرے ہیں کہ آل محمدؐ نے اور اصحاب محمدؐ نے ختم نبوت کی حفاظت کے لیے کہیں منکر ختم نبوت کو قتل کر کے ختم نبوت کو بچایا اور کہیں اپنے آپ کو قتل کروا کے ختم نبوت کو بچایا۔ اور پھر حسینؑ کے یہ آخری فقرے آج بھی فضا میں گونج رہے ہیں۔ یوم عاشورہ

ریت کے ٹیلے پر کھڑے ہو کر حسینؑ مسلمانوں کے مجمع سے کہہ رہا ہے۔

• مسلمانو!...... سن لو۔ زمین و آسمان سُن رہے ہیں۔ اللہ کے فرشتے سُن رہے ہیں فضا و ہوا سُن رہی ہے۔ خاک سُن رہی ہے۔ پانی کے قطرے سُن رہے ہیں ہوا کے ذرے سُن رہے ہیں شجر و حجر سُن رہے ہیں۔ دُنیا کی ہر شے سُن رہی ہے۔ پوری کائنات سُن رہی ہے کہ میں کہہ رہا ہوں۔

• انا ابن رسول اللہ •	میں بیٹا ہوں رسولؐ کا یعنی ابد تک نبی کا بیٹا پیدا نہیں ہوگا کیونکہ نہ نبی ہوگا نہ ہی نبی کا بیٹا ہوگا۔
انا ابن بنت رسول اللہ •	میں محمد رسول اللہ کی بیٹی کا بیٹا ہوں۔ کیونکہ قیامت تک رسولؐ کی بیٹی کا بیٹا نہیں آسکے گا۔ نہ رسولؐ ہوگا نہ اس کی بیٹی ہوگی اور نہ اس کا بیٹا ہوگا۔

یہ کہہ کر حسینؑ نے بلند آواز سے کہا "ھل من ناصر"
کوئی ہے جو ختم نبوت کے بچانے میں میری مدد کرے
پھر فضا پر نعرہ ھل من ناصر گونج رہا ہے اور ہم حسینؑ سے وعدہ کرتے ہیں

• حسینؑ!

ہم وعدہ کرتے ہیں کہ نبی نانا کی ختم نبوت کو محفوظ رکھنے کے لئے ہر وہ قربانی جو ہم دے سکتے ہوں، دیں گے۔ مگر ختم نبوت پر آنچ نہیں آنے دیں گے۔ یہ کبھی ہو نہیں سکتا کہ ـــ

ہو سیہ خانوں کی رونق اور آشفتہ خانے بسیں
شمع کل بجھنے سے پہلے کیوں نہ پروانے جلیں

لہٰذا آج ہم عہد کرتے ہیں کہ ہم پروانے موجود ہیں اور شمع محمدی پر جلنا ہمارا

زرتشت ۔

محترم بزرگو!

آج مجھ سے یہ پوچھا جا رہا ہے کہ ختم نبوت پر ایمان نہ رکھنے والے مسلمان ہیں یا نہیں؟
ضروری ہے کہ ان کے مسلمان ہونے یا نہ ہونے کے پیچھے یہ ڈر دکھائے جا رہے ہیں
اپنے لیے کیا فیصلہ کروں کہ آیا میں بھی مسلمان ہوں یا نہیں؟ اور وہ اس سے گزر چکے
اخباروں میں پڑھا ہے اور اپنے کانوں سے سنا ہے کہ اس ملک کے بانی قائد اعظم
کے جنازے پر کھڑے ہو کر یہ کہا گیا تھا کہ میں ایک مسلمان حکومت کا کافر ملازم ہوں یا
ایک کافر حکومت کا مسلمان ملازم ہوں۔

پھر دوسرا جو شخص یہ کہہ رہا تھا کہ اگر تم مسلمان ہو تو میں کافر ہوں اور اگر میں مسلمان
ہوں تو تم کافر ہو۔

لہٰذا آج میں اس شخص کے فیصلے کے مطابق اپنے لیے فیصلہ کرتا ہوں کہ اگر
میں مسلمان ہوں تو بقول اس کے وہ خود بخود کافر ہو گیا۔ ورنہ میں کافر ہونے کا فیصلہ
کروں گا۔ مجھے تو اپنے بارے میں فیصلہ کرنا ہے۔

اور یاد رکھو!

حکومتیں کوئی فیصلہ نہیں کیا کرتیں۔ یہ فیصلہ رب ہی کرتا ہے۔

دیکھو نا! نبوت سے قومیں بنتی ہیں اور امتیں بھی۔ ہر نبی پیدا ہوتا ہے اور
قومیں ادھر ادھر ہوتی ہیں۔ اب آج اگر کوئی صاحب نئی نبوت لے کر آئے
ہیں تو وہ الگ امت ہو گئے اور ہم الگ امت ہو گئے۔ اب جب ہم الگ الگ
امت ہو گئے تو ہمیں کون مجبور کر سکتا ہے کہ ہم ایک ہو جائیں بلکہ وہ تو علیحدہ امت بن کر
ہم سے علیحدہ ہو چکے ہیں۔ لہٰذا ہم علیحدہ ہیں اور وہ علیحدہ ہیں۔ بس اسی علیحدگی
کا نام تم نے بائیکاٹ رکھ لیا ہے حالانکہ یہ بائیکاٹ کوئی انوکھی چیز نہیں ہے۔

بائیکاٹ کا تو صرف مطلب یہی ہے کہ تم اور ہو۔ اور ہم اور ہیں۔ ہم کسی کا راستہ نہیں۔ ہم کسی کو ستاتے نہیں۔ ہم تو یہی کہتے ہیں کہ تم اور ہو۔ ہم اور ہیں۔ تم نے خود ہی نئی نبوت بنا کے اپنے کو علیحدہ کر لیا لہٰذا تم اور ہو۔ ہم اور ہیں۔ ہمارا تمہارا کوئی میل نہیں۔ ہمارا تمہارا کوئی رشتہ نہیں، ہمارا تمہارا کوئی ناطہ نہیں لہٰذا تمہارا یہ کہنا کہ ہمارا بائیکاٹ کیوں کرتے ہو، اگر ہم نے کوئی نئی نبوت بنالی ہے تو تمہیں کیا اعتراض ہے۔ شیعہ سنی بھی تو آپس میں لڑتے ہیں؟۔

سامعین!

ہم کب کہتے ہیں کہ ہم شیعہ سنی آپس میں نہیں لڑتے ہم لڑتے ہیں اور انشاء اللہ قیامت تک لڑتے رہیں گے۔ مگر

یاد رکھو! ... اگر کوئی سنی مجھے قتل بھی کر دے گا تو میرا جنازہ بھی وہی پڑھے گا۔ مجھے دفن بھی وہی کرے گا۔ رہ گئی ہماری لڑائی تو وہ صرف یہی ہے کہ شیعہ سنی دونوں ہم بھائی ہیں اور ہم دونوں بھائی اس بات پہ جھگڑ رہے ہیں کہ محمد ﷺ ہم دونوں کے باپ ہیں۔ شیعہ کہتا ہے کہ میں اپنے باپ کو زیادہ پیارا ہوں اور سنی کہتا ہے میں باپ کو زیادہ پیارا ہوں گویا شیعہ سنی کا تو اس بات پہ جھگڑا ہے کہ باپ کو پیارا کون ہے؟ اور جس نے ختم نبوت ہی کا انکار کر لیا ہو اس کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ ہمارے خانگی معاملات میں دخل دے۔

حضرات!

اگر منطق کی رو سے، کسی فلسفے کی رو سے، کسی استدلال کی رو سے آج میں یہ کہوں کہ میں نبی ہوں اور میرے نبی ہونے کی دلیل یہ ہے کہ شیعہ سنی آپس میں لڑتے ہیں تو آپ کہیں گے کہ اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ یہ پاگل ہو گیا ہے کیونکہ شیعہ سنی کا جھگڑا اور چیز ہے اور نبوت کی دلیل اور چیز ہے۔ اگر ہم شیعہ سنی لڑتے ہیں

دو رہنے دو۔ ہماری لڑائی کا ذکر چھیڑنے کا مقصد یہ ہے کہ ان احمقوں کے پاس اپنی نبوت کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ یہ اپنی خواہ مخواہ کے لئے ہماری لڑائی کی بات چھیڑ دیتے ہیں۔ شیعہ سنی کی لڑائی ہمارے گھر کی بات ہے۔ ہمارا اپنا قصہ ہے۔ کسی کو ہمارے گھریلو معاملات میں دخل دینے کی ضرورت نہیں ہے۔

سامعین!

پاکستان بننے سے پہلے میں قادیان (ہندوستان) میں تقریر کر رہا تھا اور میرے سامنے ایک تختہ سیاہ لگا دیا گیا جس پر لکھ دیا گیا۔ "آپ کا مذہب شیعہ ہے"؟

میں نے کہا۔ "جی ہاں۔ فرمایئے کیا بات ہے؟"

"مہدی صاحب، یہ بتائیں کہ شیعہ صاحبان کا خلفائے ثلاثہ کے بارے میں کیا عقیدہ ہے"؟

میں نے کہا۔ "آپ کو کیا تکلیف ہے۔ آپ کون ہیں پوچھنے والے؟"

"مہدی صاحب، ہم تو ویسے ہی پوچھ رہے تھے۔"

میں نے کہا میری بات سنو! ہر شیعہ کا یہ عقیدہ ہے کہ خلفائے ثلاثہ کا گھرانا جس جگہ پر پیشاب کرتا تھا۔ اس کے قطرے کے برابر بھی نیا نبی نہیں ہو سکتا۔ ہمارا تو یہ عقیدہ ہے۔ تم اپنی فکر کرو۔ تمہیں ہمارے جھگڑے سے کوئی واسطہ نہیں۔

دیکھو نا!

یہ بھی خوش نصیبی ہوئی کہ آج ہم بھائی بھائی بیٹھے ہیں گھر جا کر آپس میں تقسیم ہو لیں گے۔ شریک جو ہوئے۔ پیر لوگ آج ہم دشمن کے سامنے اکٹھے بیٹھے ہیں۔ اور انشاء اللہ اکٹھے مل کر دشمن کے سوال کا منہ توڑ جواب دیں گے۔

صاحبان! جب ہم ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آئے

تھے تو دائے ہیں۔ غیر مسلم، ہمارے قافلوں پہ حملے کر رہے تھے تو بتاؤ!
اس وقت ہمیں قتل کرتے وقت وہ پوچھا کرتے تھے کہ تم سنی یا شیعہ ہو؟۔

ہرگز نہیں۔

لہذا جب ہم قتل ہونے کے لئے ایک تھے تو زندہ رہنے کے لئے کیوں نا ایک ہیں
بہرحال یہ فضول باتیں آج ہمیں چھیں گی تو فیصلہ ہو کے رہے گا۔ دودھ کا دودھ
اور پانی کا پانی ہو کر رہے گا۔ یا ہم مسلم ہیں یا تم کافر ہو۔ یا میرا گریباں چاک یا آپ
گریباں چاک۔ یہ فیصلہ ضرور ہوگا دیر ہی ہو۔ جب ہو ہر کیف یہ فیصلہ ہو کے رہے گا
اور وہ گیا۔ امن، تو شنو ہیں اس کی طعن کرتے رہو

ہم سے بہتر پرامن، مسکولی ہے وہ وہ ہی ہوگا ہم تو بالکل پرامن ہیں۔

دیکھو نا! ہم ہیں مومن، اور مومن کا استغنا ایمان سے ہے اور ایمان
ہمارے افعال کے وزن پر اس کا دارومدار ہے … تو ایمان نہیں ہوتا۔

بہرحال مومن تو ہوتا ہی پرامن ہے آج تم ہمیں اس کی تلقین کرتے ہو جاؤ
پہلے اپنے کو پرامن بناؤ۔

آپ حضرت کہتے ہیں، زیدی صاحب ہم نے دودھ پلا دیا تھا اور
ساتھ ہی مثال یہ دیتے ہیں کہ علی نے بھی اپنے قاتل کو شربت پلایا تھا۔

میں کہتا ہوں: اگر میرے … علی نے اپنے قاتل کو شربت پلایا تھا تو اگر ضرورت
پڑی تو ہیں بھی اپنے قاتل کو شربت پلا دوں گا مگر تمہارے پاس کوئی ایسی دلیل نہیں ہے
کہ علی نے ختم ہوتے ہوئے … کو شربت پلایا ہو۔

بہرحال بیانات کا مطلب یہ ہے کہ ہم امن ہیں … ہمارا تمہارا کوئی واسطہ
نہیں۔ ہمارا تمہارا کوئی تعلق نہیں۔ اس میں نہ کوئی جھگڑا ہے، وہ نہ ہی کوئی فساد ہے
بہرکیف! ہم پہلے بھی … ہیں اور پرامن رہیں گے۔ انشاءاللہ، اور

جیسا کہتے ہیں کہ ہم اپنے "ایمان" کے زور سے مرزا بے ایمان "کو" سمجھائیں کہ یا تو اسے "مومن" ہونا پڑے گا یا پھر ہم سے علیحدہ ہونا پڑے گا۔

بزرگان من!

خواہش ہے اس میں ترمیم کا مذہب کہ اگر کوئی غیر مسلم اقلیت ہو جائے کیونکہ غیر مسلم اقلیت ہونے سے وہ ہماری حفاظت میں آ جائیں گے۔ وہ ہماری ذمی بن جائے گی اور ہم اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہو جائیں گے۔ فرق صرف یہ ہے وہ ذمی ہماری حفاظت میں ہیں مذہب کی شرط نہیں مذہب کی بجائے ہماری "رعایا" ہونے کے ہماری حفاظت میں آ جائے گی۔

سامعین!

میں اپنے بیان کو یہاں پر ختم کرتا ہوں کہ میں نے اپنی پوری تقریر میں نہ تو کسی صاحب کا نام لیا اور نہ کسی پر فرداً فرداً تنقید کی ہے۔ صرف حقیقت بیان کی ہے یا اپنا عقیدہ بیان کیا ہے۔

عزیز بچو!

دکھ تھا اس بات کا کہ مجھے کسی کا نام آتا ہی نہیں۔ میرے ہم وطن یو۔پی والوں کو دہرا لگا اور مجھے بھی یاد ہے کہ جب میں بچہ تھا تو میری ماں سردیوں میں میرے کپڑے میں روئی سی کر مجھے پہنایا کرتی تھی جسے یو۔پی کی زبان میں "مرزائی" کہتے ہیں۔ اب پاکستان میں آ کر ہم نے وہ بھی پہننا چھوڑ دی اور اس کے عوض سویٹر پہنتے ہیں۔ لہٰذا مجھے کسی کا نام یاد ہی نہیں رہا۔ میرا فرض ہوا تو عزیزی مقصد یہی ہے کہ حضور کے نبی ہونے اور اس کے اعلان کے بعد حقی۔ ظلی۔ بروزی۔ چھوٹا بڑا۔ خدانخواستہ شاعرانہ طور پر بھی کوئی اور نبی ہو سکتا ہی نہیں۔ اگر وہ مسئے زمین کے سارے مُردوں کو زندہ کر دے جب بھی نبی نہیں۔ الا اس کی

ساری زمینیں گونیاں صحیح ہو جائیں۔ جیب بھی نہیں۔ وہ کچھ بھی کر دے جیب بھی نہیں۔

لہذا جیب ایک بات طے شدہ ہے کہ نہیں تو نہیں ہی نہیں ہے۔ گویا محمدؐ کے بعد کوئی نبی ہو سکتا ہی نہیں۔

پیارے بچو! ایک دن مجھے کسی شخص نے کہا۔

" زیدی صاحب! آج فلاں فرقے کا جلسہ ہو رہا ہے۔ وہاں تم بھی چل کے شرکت کرو۔ کیونکہ وہاں وہ اپنی نبوت کے دلائل پیش کریں گے "

میں نے کہا نہیں بھئی! آج مجھے فرصت نہیں ہے کل آؤں گا۔ آج میں کسی اور جلسہ میں جا رہا ہوں۔

اس نے پوچھا کون سا جلسہ؟

میں نے کہا۔ سُنا ہے۔ اللہ میاں مر گئے ہیں اور آج اس کی تعزیت میں جلسہ ہو رہا ہے لہٰذا میں بھی اسی جلسہ میں شرکت کرنے جا رہا ہوں "

اس نے کہا۔" زیدی صاحب! شرم کرو۔ ہوش میں ہو۔ کہیں اللہ بھی مر سکتا ہے؟"

پس بھائیو! جس طرح اللہ نہیں مر سکتا اسی طرح محمدؐ کے بعد کوئی نبی نہیں آ سکتا جس طرح وہ ناممکن ہے اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے۔

بچو!

سُنا ہے کہ بھیڑ کے بچے نے ماں سے کہا کہ۔

" ماں! خود کیا شے ہوتی ہے؟

بھیڑ نے جواب دیا۔

" بیٹا! چپ رہو۔ لوگوں کا کچھ پر ہی شبہ ہے "

بس بھائیو! اسی طرح کسی نے کسی پاگل سے پوچھ لیا کہ

"قبلہ! نبی کیسے لگتے ہیں؟"

تو اس نے جواب دیا۔

"چپ رہو۔ لوگوں کا مجھ پر ہی شبہ ہے۔"

بہرحال، اسی طرح بننے والا بن جاتا ہے اور بعد میں پتہ چلتا ہے کہ یہ کیا ہو گیا۔

لہٰذا ہمارے نوجوان بچے اپنے ذہنوں میں یہ بات بٹھا لیں کہ محمد ﷺ کے بعد اور کوئی نبی ہو سکتا ہی نہیں۔ وہ خاتم الانبیاء ہیں اور وہی سید الانبیاء ہیں۔ یہی ہمارا ایمان ہے اور یہی ہمارا اعتقاد ہے۔

خداوند عالم، تمہارے ایمان کی حفاظت فرمائے۔ تمہارے ایمان کو مستحکم فرمائے اور تمہیں توفیق استقامت عطا فرمائے۔ تاکہ تم کہیں ڈگمگا نہ جاؤ۔ گھبرا نہ جاؤ۔ چاروں طرف سے دشمن کی یلغار ہے اور عشق محمد ﷺ جیسی قیمتی شے تمہارے پاس ہے کہیں کوئی چور ڈاکہ ڈال کر تم سے یہ قیمتی ہیرا چھین نہ لے۔ اللہ تمہاری تائید فرمائے گا۔ تم حق پر ہو اور حق کی اللہ تعالیٰ خود مدد فرماتا ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

عقيدة

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
خداوند عالم کی حمد و ثنا کے بعد حضرات محمدؐ و آلِ محمدؐ پر
درود و سلام

حضراتِ گرامی قدر!

مجھ سے پہلے سرکار علامہ سید فدا حسین قبلہ مدظلہ العالی بیان وعظ فرما رہے تھے جس میں انہوں نے فرمایا کہ حضور سیدہ طاہرہ سلام اللہ علیہا کی سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ وہ حسنؑ و حسینؑ جیسے اعلیٰ مقام کی ماں ہیں۔ لہٰذا آج میں بھی علامہ موصوف سے معذرت چاہتے ہوئے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نے بجا فرمایا کہ حسینؑ کی ماں ہونا بہت بڑی سعادت ہے مگر میں یہ کہتا ہوں کہ سیدہ کی سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ وہ رسولؐ کی ماں ہے۔

ہر دور میں ماں کا رشتہ مقدس اور قابلِ فخر ہے

حضور والا!

ایک دن حضور رسالت مآب مسجد نبوی میں منبر پہ بیٹھے وعظ فرما رہے تھے کہ اچانک جناب سیدہ طاہرہ سلام اللہ علیہا مسجد میں تشریف لائیں رسولؐ نے جب دیکھا تو خطبہ چھوڑ کر تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے۔ پاس بیٹھنے والوں میں سے کسی نے پوچھ لیا۔

"حضور! یہ بی بی کون ہے جس کی اتنی تعظیم کی جا رہی ہے"

رسولؐ نے فرمایا "یہ بی بی اپنے باپ کی ماں ہے"

سامعین! اگر رسولؐ کہہ دیتے کہ یہ بی بی میری بیٹی ہے تو کیا غلط تھا؟

ہرگز نہیں۔

مگر دشمنوں نے یہ کہہ کر کہ بچی اپنے باپ کی ماں ہے۔ ہمیں یہ بتا دیا کہ اگر مجھے رسالت ملی ہے تو اسی بچی کے صدقے میں۔ اگر نبوت ملی ہے تو اسی بچی کے صدقے میں۔ یہ گویا میری نبوت و رسالت کی ماں ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ماں کسے کہتے ہیں؟

نوجوانو، عزیزو، بچو!

یاد رکھو! ماں اسے کہتے ہیں جو کسی شے کی تربیت اور دنیا میں آنے کا باعث بنے۔ جیسے بھارت ماتا، مادرِ وطن وغیرہ وغیرہ۔ مادرِ وطن کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم وطن کے پیٹ سے پیدا ہوئے ہیں بلکہ یہ وہ سرزمین ہے جو اس دنیا میں ہمارے آنے کا باعث بنی۔

جس نے ہماری غذا اور خوراک دی۔ ہماری ضروریات کی جو کفیل ہوئی۔ اسی لئے یہ مادرِ وطن ہے اور جس ذریعے سے ہم اپنے مطلب کو دوسرے تک پہنچا سکیں۔ اسے ہم مادری زبان کہتے ہیں خواہ باپ بھی یہی زبان بولتا ہو۔ مگر مادری زبان کہلائے گی نا کہ پدری زبان کہلائے گی۔

پھر لفظ "رسالت" کے اندر جو لطافتیں اور وسعتیں ہیں ان کا شمار و بیان ناممکن ہے۔

صاحبانِ ذوق!

ہو سکتا ہے۔ لفظ رسالت عرشِ الٰہی پر جا کر خدا سے یہ شکایت کرے کہ۔

خداوندا! تو نے مجھے بڑا محبوب بنایا تھا مگر کیا کروں اس لفظ میں کچھ ایسے بھی شریک ہو چکے ہیں کہ جن کی وجہ سے مجھے "ماں"

کہلاتے ہوئے شرم آنے لگتی ہے۔ وہ وہاں گیا اور جھگڑنے لگا۔

پھر فضا رسول نے کہہ دیا: "یہ بچی اپنے باپ کی ماں ہے"

یاد رکھو: اس کے معنی ہی یہی ہیں کہ یہ ہے معدن عصمت اور
خزانۂ عصمت۔ اگر عصمت کا خزانہ دنیا میں نہ ہوتا تو کوئی نبوت نبوت
نہ رہتی اور کوئی امامت۔ امامت بھی گویا نبوت و امامت اسی عصمت کے
صدقے میں باقی رہ گئی۔

حضور والا!

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ عصمت رسول کو کس شان سے ملی!
دیکھو نا: اہل بیت رسول کی طرف سے ایک مشہور معروف حدیث
ہے کہ حبیب رسول معراج میں تشریف لے گئے اور مقام جنت میں پہنچے۔

سامعین:

محمد مصطفیٰ کی جنت وہ جنت نہیں ہے جس سے آدم نکالے گئے
تھے اور جہاں آمد و رفت کے سلسلے قائم ہیں۔ گویا محمد کی جو جنت
ہے وہ جنت آپ محمد ہے جہاں ہمارا تصور بھی نہیں جا سکتا۔
جہاں ہمارا وہم و خیال بھی نہیں جا سکتا کیونکہ جب محمد کے نعلین
تک کسی نبی کا گذر نہیں ہو سکتا تو محمد کی جنت تک کون پہنچ سکتا ہے؟

پھر نبی رسول وہاں معراج اپنی جنت کا معائنہ فرما رہے تھے اور حبیب رسول
نے اس سے اعلیٰ شجر دیکھے تو سب سے اعلیٰ شجر پر آپ کی نگاہیں رک گئیں۔ جی چاہا
کہ اس شجر کا ثمر چکھے۔ اب محمد کے دل کی خواہش تھی کہ وہ ثمر خدمت حضور
رسالت مآب میں پہنچا۔ اور حضور نے عالم معراج میں اسے تناول فرما لیا۔

سامعین! حدیث میں بھی یہی فقرہ ملتا ہے کہ حضور نے عالم معراج

بھی وہ ثمر تناول فرمایا اور۔

ادھر مولوی صاحبان یہ فرماتے ہیں کہ روح تو کچھ کھاتی پیتی ہی نہیں مگر یہاں لکھا ہے کہ تناول فرمایا۔ اور پھر لطف یہ ہے کہ تناول فرمانے کا فقرہ یہی بتاتا ہے کہ رسول کو جسم کے ساتھ معراج ہوا تھا۔

بہرکیف رسول نے وہ ثمر تناول فرمایا اور اس ثمر کی عجیب و غریب خوشبو رسول کے دماغ میں بس گئی۔ بڑا ہی لطف آیا۔ بڑا ہی مزا آیا۔ اب جو وہ ثمر کھانے کے بعد رسول اپنے میزبان سے ہمکلام ہوئے اور میزبان نے اپنے لب و لہجہ میں گفتگو کی تو سماں اور بھی زیادہ ہو گیا۔ گویا عالم معراج میں انداز کلام بھی دماغ میں بس گیا اور خوشبوئے طعام بھی دماغ میں بس گئی۔ اسی طرح رسول معراج سے واپس گھر پہنچے اور اب رسول کے پاس معراج کی دو یادگاریں تھیں۔ ایک میزبان کے لب و لہجہ کی لطافت۔ دوسرا ایک اس ثمر کی خوشبو۔

صاحبانِ ذوق!

یہی وجہ تھی کہ رسول جب میزبان کے لہجے کے مشتاق ہوتے تو اپنے بھائی کو دیکھ کر فرماتے۔

"یا علی! ادھر آؤ ہم سے کوئی بات کرو۔"

چنانچہ بھائی سے باتیں شروع ہو جاتیں۔ اور لہجہ معراج کا لطف بھی آ جاتا اور جب اس ثمر کا مزا لینا چاہتے جو جنت آلِ محمد میں عالم معراج میں تناول فرمایا تھا تو بیٹی کو سینہ سے لگاتے۔ "بیٹی! ذرا میرے پاس بیٹھو ہم سے گفتگو کرو۔ تم سے اس ثمر کی خوشبو آتی ہے۔"

حضور والا!

واقعہ معراج کے سلسلہ میں خدیجۃ الکبریٰ کے بطن طیب و طاہر سے اللہ نے رسول

کو ایک دُختر عطا فرمائی۔ رسُولؐ نے بیٹی گود میں اُٹھائی۔ مگر کبھی اِدھر دیکھتے اور کبھی اُدھر دیکھتے ہیں کبھی اوپر دیکھتے ہیں اور کبھی نیچے دیکھتے ہیں۔ رسُولؐ کی اس گھبراہٹ کو دیکھ کر خدیجہؓ پوچھتی ہیں۔ "قبلہ! کیا بات ہے؟"

رسُولؐ نے فرمایا۔

"خدیجہؓ! یہ تو بالکل اُسی ثمر کی خوشبو ہے جو میں نے عالم معراج میں جنّت میں کھایا تھا"

گویا رسُولؐ کو معراج کے کارنامے کا آج ثمرہ ملا۔

سامعین!

آج تو رسُولؐ کو بھی لطف آگیا کہ اگر طعام کے شائق ہوں تو بیٹی کے پاس بیٹھ جائیں اور اگر کلام کے شائق ہوں تو بھائی کے پاس بیٹھ جائیں۔ گویا آدھی معراج کا لطف علیؑ کے پاس آجائے اور آدھی معراج کا سواد سیدہؑ کے پاس آجائے۔

یاد رکھو! اب اگر رسُولؐ ان دونوں کے گھر تشریف لاتے تھے تو ان پر احسان تھوڑا ہی کرتے تھے۔ بلکہ وہ تو اپنی معراج کے لئے آیا کرتے تھے۔

بزرگانِ من!

محمدؐ کے گھر میں بچی پیدا ہوئی۔ اعلیٰ پرورش کے سارے سامان فراہم کئے گئے ثمر معراج کی بات تو رُوحانی بات تھی مگر دنیاوی نقطۂ نظر سے بھی جواہرات کا پچھلا اس کے منہ میں تھا۔ سینکڑوں کنیزیں ایسی تھیں جو تیس تولے سونے کی پیٹی کمر پہ باندھے اس بچی کی خدمت میں کھڑی تھیں اور وہ جواہرات سے جڑے ہوئے خاص سونے کے گہوارے میں لٹایا گیا تھا۔ آخر ملکۂ عرب کی بیٹی تھی عرب کی تھی۔ عرب کی سرفراز شریف زادیاں اس بچی کے گہوارے کی ڈوریاں ہلانا باعث فخر سمجھتی تھیں۔ گویا رُوحانی عظمتیں محمدؐ کی بدولت اور دنیاوی راحتیں ماں کی بدولت اس بچی کو حاصل

تھیں۔ اسی طرح شہزادی کی بڑے ناز و نعم کے ساتھ پرورش کی جا رہی تھی۔

سامعین!

زمانے کا انقلاب کہو یا وقت کی گردش کہو کہ ابھی بچی تین سال کی تھی کہ باپ پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے کہ وہی لوگ جو محمد کے پاس بیٹھتے تھے انہیں پاس نہ آنا۔ جن سے خون کا رشتہ تھا وہ لہو کے پیاسے ہو گئے۔ جو گلے ملتے تھے۔ انہیں گلا پکڑنا ہو گیا۔ جن سے پیار تھا وہ دور ہٹنے لگے۔ جن کے دل موم کی طرح نرم تھے۔ وہ سنگدل ہو کے پتھر مارنے لگے۔ جو پھولوں کی طرح کھلتے تھے وہ کانٹے چبھانے لگے۔ جن کے ساتھ دوستی تھی۔ وہ دشمنی کے ساتھ پیش آنے لگے۔ جو دیکھ کے مسکراتے تھے وہ منہ بنانے لگے جن کی عزت ہماری تھی وہ ذلیل کرنے کے درپے ہو گئے۔ جو اپنے تھے وہ غیر بن گئے۔ غرض تمام کائنات ایک انسان کے مقابلے میں اکٹھی ہو گئی۔ اور محمد ایک طرف اکیلے کا اکیلا کھڑا ہے۔ اور اکیلا بھی نہیں نہ سر پہ باپ کا سایہ۔ نہ استاد کا سایہ۔ نہ مرشد کا سایہ۔ نہ خاندان کا سایہ۔ نہ کسی محافظ کا سایہ اور حد یہ کہ نہ اپنا سایہ۔ آفتاب بے سایہ انسان ایک طرف ہے اور پوری دنیا اس کی مخالفت کر رہی ہے۔

اب بتاؤ! جب ایسے انسان پہ جس پر اتنے زیادہ مصائب ہوں تو اس کی پوزیشن کیا ہو گی۔ اسی دوران کسی نے سیدہ سے کہا ارے کعبہ کے سامنے صحن میں دشمنوں نے تیرے باپ کو گھیر رکھا ہے وہ سجدے میں ہیں، ان کی کمر پر دنیا بھر کے بوجھ لاکے رکھ دیئے گئے ہیں۔

یہ سنکر بچی روتی ہوئی گھر سے باہر نکلی۔ تین برس کا سن۔ جب مشرکین نے بچی کو آتے دیکھا تو چلائے۔

ہٹ جاؤ۔ خدیجہ کی بچی آ رہی ہے۔

گویا مشرکین کے دل میں بھی خدیجہؓ کی اتنی عظمت تھی۔ اب ان مشرکین سے کون پوچھے کہ جب خدیجہؓ کی تین سال کی بچی کا تو اتنا احترام کیا جا رہا ہے مگر اس کی جوان بچیوں کو طلاق دے کر گھر سے کیوں نکال دیا۔ دیکھا اس وقت احترام خدیجہؓ یاد نہ تھا۔ بہر نوع اس شان شوکت سے حضرت سیدہ طاہرا سلام اللہ علیہا کی پرورش ہوتی رہی۔ جب آپ نو سال کا سن ہوا تو حضورؐ مکہ سے ہجرت کرنا پڑی۔ چنانچہ حضورؐ اپنے فرزندوں کو چھوڑ کر مدینہ تشریف لائے۔

حضور والا!

آپ لوگ جذبات وعقیدت کی رو سے ہجرت کے تعلقات سنتے ہیں کبھی ان واقعات کو دنیاداری اور عام معاملات کی رو سے بھی تو دیکھا کریں کہ اتنا بڑا خطرناک ماحول۔ دشمنوں کا اتنا بڑا غلبہ کہ محمدؐ کا رہنا دشوار ہو رہا ہے۔ اتنے بڑے خطرناک ماحول میں محمدؐ اپنی جان بچا کے تو چلے گئے مگر بیٹی کو اور اپنے ناموس کو دشمنوں میں ہی چھوڑ دیا۔

اب بتاؤ! اپنی بیٹی اور ناموس کو دشمنوں میں اکیلے چھوڑ کر اپنی جان بچا کر چلے آنا۔ یہ کوئی شریفوں کا شیوہ ہے؟ آخر محمدؐ نے اپنی بیٹی اور ناموس کی حفاظت کا کوئی پکا انتظام کیا ہو گا۔ کہ رسولؐ کو اپنے ناموس چھوڑنے پر کوئی خطرہ ہی نہیں محسوس ہوا اور اپنی جوان بیٹی کو اتنے بڑے خطرناک ماحول میں چھوڑ کر چلے جانا ناممکن بات تھی۔ اللہ جانے ایک نوجوان نے رسولؐ کے گھر میں رہ کر کتنی چیزوں سے رسولؐ کو مطمئن کر دیا۔ نہ ناموس کا خطرہ باقی رہنے دیا اور نہ ہی دشمنوں کی

زندگی کا خطرہ باقی رہنے دیا۔

صاحبان!

دنیاوی نقطۂ نظر سے کبھی یہ بھی سوچ لیا کرو۔ کہ وہی بھرے جتھے عرب اور بڑے بڑے مشرک جماعات کو قتل رسولؐ کے لئے آئے تھے۔ آن

رشتوں کے گم ہو جانے پر ان کا غصہ ایک دم بڑھ گیا ہوگا یا نہیں؟ بہت ہی بگڑے ہوں گے۔ بڑا ہی غصہ آیا ہوگا۔ اپنے ہی ہاتھوں کو کاٹتے ہوں گے کہ ہم سے کیا غلطی ہو گئی؟ ہم نے آتے ہوئے شکار کو کیوں جانے دیا۔ اور سب سے زیادہ غصہ تو اس نوجوان پر آیا ہوگا کہ جس نے ان کی ساری سکیم کو بستر پر سو کے ضائع کر دیا۔ چنانچہ حضرت ابولہب اور ابو جہل صاحب۔ جو تمام قبائل کے تجربہ کار رہبر تھے۔ اس بچے کی اس حرکت کو دیکھ کر بہت پریشان ہوئے اور کہنے لگے۔

اس بچے نے تو ہمارا تمام پروگرام خاک میں ملا دیا۔ اس بچے سے تو وہ بڈھا اچھا تھا جو دوسرے کے اشارے دیتا رہا۔ اللہ جانے اس بچے نے کیا کر دیا۔ ابی طالب کا یہ لڑکا تو بڑا ہی عجیب نکلا۔

میں کہتا ہوں، بزرگو!

تم فکرمند کیوں ہو گئے۔ اگر واقعی اس بچے نے تمہارا منصوبہ خاک میں ملا دیا ہے تو بہتر ہے کہ تم اسی سے ہی سارا بدلہ اتار لو۔ اور پھر یہ بچہ بھی بڑی نازک پوزیشن میں ہے، کیونکہ اس کے ساتھ پردہ دار خواتین بھی ہیں۔

سامعین!

تاریخ عالم گواہ ہے کہ جب یہ عرب سردار اس نوجوان کے پاس آئے اور پوچھا کہ محمد کہاں ہیں، تو تمام مذاہب فکر کی تاریخ پڑھ کر دیکھیں یہی فقرہ ملے گا۔ کہ اس نوجوان نے جواب میں صرف یہی کہا کیا تم محمد کو میرے سپرد کر گئے تھے۔ جاؤ میرے گھر سے نکل جاؤ!

تاریخ عالم گواہ ہے کہ بچے کا فقرہ سن کر تمام اہل مکہ خاموش ہو گئے۔ اللہ جانے

اس نوجوان کا ان لوگوں پر کتنا رعب تھا کہ صبح کو وہی اُن سے کہہ رہا ہے کہ مجھے چار اونٹ کرائے پر چاہیئں۔ لطف یہ ہے کہ اونٹ ان ہی سے مانگ رہا ہے۔ جو رات کو گھر گھیرے کھڑے تھے اور بڑی شان و تمکنت سے کہتا ہے "دیکھو! آج ہم جا رہے ہیں کسی میں ہمت ہو تو روک کے دیکھ لے"

اب بتاؤ۔ قدرت کے بنائے ہوئے سمندر کے دھارے کو کون روک سکتا ہے اور اللہ کی چلائی ہوئی بجلی کی لہر کے سامنے کون ٹھہر سکتا ہے۔ پھر حضرت علیؓ بڑے آرام سے اونٹوں پر سامان بندھوا کے۔ پردے کا انتظام کر کے مستورات کو سوار کر کے۔ خود پیدل چل پڑے اور یوں کہتے جا رہے ہیں۔

مکے والو! ہم جا رہے ہیں۔ کسی میں ہمت ہے تو روک کے دیکھ لے۔

بھائیو! ایک بات یہ ذکر کر دوں۔ اہلِ مکہ محمدؐ کے اہل و عیال کو یرغمال کر لیتے تو محمدؐ واپس آنے پر مجبور ہو جاتے۔ لیکن کسی کو ہمت ہی نہیں تھی کہ نہیں روک سکتا۔ تاریخ عالم اس بات پر دنگ ہے کہ اس بچے میں کیا کمال تھا کہ اتنے بڑے دشمنوں کے نرغے سے ناموسِ رسولؐ کو نکال کر لے آیا۔

پھر لوگ تاکتے ہی رہ گئے اور سب اہلِ مکہ اپنے گھروں کے پیچھے۔ مکانوں کی چھتوں پہ منڈیروں کی آڑ میں بیٹھے بیٹھے یہ کہہ رہے ہیں کہ اللہ جانے۔ محمدؐ کا یہ بھائی کتنا زبردست ہے۔

سامعین کرام!

یکم ربیع الاول کو محمدؐ نے مکے سے ہجرت کی اور جب قافلۂ ناموسِ محمدؐ مدینے پہنچا تو اس دن آٹھویں ربیع الاول تھی اور جب رسولؐ اپنے ناموس مستورات کے ساتھ مدینہ وارد ہوئے تو نو ربیع الاول تھی۔ بہرکیف! ربیع الاول گزرا۔ ربیع الثانی گزرا۔ جمادی الاول گزرا۔ جمادی الثانی گزرا۔

حتیٰ کہ جب ذیقعد کا آخری ہفتہ تھا تو کچھ سنا دید عرب نے بقول مسلمانوں کے جو آسمانِ اسلام کے شمس و قمر کہلوتے ہیں، انہوں نے آپس میں صلاح مشورہ کیا اور سر جھکائے رسُولؐ کی خدمت میں آ بیٹھے۔

رسُولؐ نے پوچھا: "کیوں بھئی۔ خیریت تو ہے۔ آج بڑے اُداس دکھائی دیتے ہو؟"

چھوٹے بھائی نے بڑے بھائی سے کہا: "بڑے بھائی! تم کہو نا۔"

رسُولؐ نے پھر فرمایا: "کہو۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟"

چنانچہ دونوں نے جو آسمانِ اسلام کے شمس و قمر کہلاتے ہیں۔ بڑے لجاجت آمیز لہجے میں عرض کی۔

"سرکار! ہم حضورؐ کے غلام ہیں، حضورؐ کے ذاکر ہیں، حضورؐ کے ہاتھوں پہ ہی مسلمان ہوئے ہیں۔"

رسُولؐ نے فرمایا،

"ہاں ہاں ٹھیک ہے مگر تم چاہتے کیا ہو؟"

"قبلہ! عرض یہ ہے کہ ہم — اگر — حضورؐ ہمیں اپنی فرزندی میں قبول کریں۔"

بس بھائیو!

تاریخِ عالم گواہ ہے کہ اتنا فقرہ منہ سے نکلنا تھا کہ رحمت اللعالمینؐ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور وہ بڑے غصے میں فرمایا۔

"خبردار! اگر کسی نے میری بچی کا نام اپنی زبان پہ لیا۔ نکل جاؤ یہاں سے۔"

سامعین! ...... اب بتاؤ: کوئی ہے جو رسُولؐ سے یہ پوچھے کہ

"حضورؐ! یہ تو بیچارے آسمانِ اسلام کے شمس و قمر ہیں جنھیں آپ نے جوڑ دیا۔ مگر یہ زیور کہ اس بچی کی بڑی بہنوں کو مشرکوں کے حوالے کر دیا تو وہ جیسی ہی نہیں تھیں یا پھر یہ بچی ان سے مختلف ہے۔"

بہر نوع۔ دونوں بزرگ حالت پریشانی میں اٹھ کر چل پڑے۔ اور آپس میں کہنے لگے۔

"اگر محمدؐ نے ہمیں ٹھکرا دیا ہے تو پھر اس کا رشتہ اللہ ہی کے ہاں سے آئے گا" ـــــــ رسولؐ نے بھی یہ گفتگو سن لی۔ دل میں سوچا۔

"میرا بھی نام محمدؐ ہے۔ میری بیٹی کا رشتہ اللہ ہی کے ہاں سے آئے گا"!

بزرگانِ من!

جس طرح ہم مولویوں کی دوڑ مسجد تک ہی ہوتی ہے اسی طرح رسولؐ کی دوڑ بھی اللہ تک ہی ہوتی ہے۔ چنانچہ محمدؐ نے دریں مصلیٰ بچھایا اور دعا مانگی۔

"خداوندا۔ یہ لوگ مجھے طعنے دے رہے ہیں۔ تو نے ہی میری بچی کو جنتِ محمدیؐ کا شرف بنایا تھا۔ تو نے ہی اس کو سیدۃ النساء بنایا تھا۔ تو نے ہی اس کو خزینۂ عصمت بنایا تھا۔

تو کہتا ہے کہ جب تک جوڑ برابر کا نہ ہو رشتہ نہ ہو۔ اب مجھے نہیں معلوم کہ اس کا رشتہ کہاں ہوگا۔ لہٰذا تو ہی بتا کہ یہ رشتہ کہاں ہوگا!"

رسولؐ یہ دعا فرما رہے تھے اور قدرت عرش کی طرف سے مسکراہٹوں کے گلدستے نذر کئے جا رہے تھے۔

• محمدؐ! گھبراؤ نہیں۔ تمہاری بیٹی کا رشتہ ہمارے گھر میں ہو گا۔
• بولو! ہمارے گھر رشتہ کرنے پر راضی ہو؟
محمدؐ نے سر جھکا کے اپنے محبوب سے فرمایا۔
• خداوندا! رشتہ تو منظور ہے مگر باضابطہ طور پر منظوری کی رسم بھی ہونی چاہیئے۔ لہٰذا تو باقاعدہ میری طرف پیغام بھیج تاکہ میں بھی منظور کروں۔
اعلیٰ حضرت نے کہا۔
• **محمدؐ!** ہم آج ہی کی رات تمہیں پیغام بھیجیں گے مگر یاد رکھنا کہیں بھول نہ جانا۔

اے حضور والا!

اعلیٰ حضرت نے اب رشتہ کی تیاریاں شروع کر دیں کہ رشتہ ہم کریں گے رشتہ ہماری طرف سے ہو گا۔ چنانچہ اعلیٰ حضرت نے آج کی رات رشتہ یوں طے کیا۔

اپنی قدرت کی بے پناہ وسعتوں کو سمیٹ کے رشتہ کرنے کا ارادہ کیا اور اپنی تمام طاقتوں کو ایک مرکز پہ جمع کیا۔ کائنات میں پھیلی ہوئی صفات تشبیہ اور سلبیہ کو ایک جگہ لا کے اکٹھا کیا اور جب اللہ صحیح معنوں میں اللہ بن کے مسند عزوجل پہ بیٹھ گیا تو کہا

"آج محمدؐ کے گھر رشتہ ہو گا"

چنانچہ چاروں طرف کہکشاں کی سڑکیں بنا دیں اور نقرئی و شیریں کے مٹکے بچھا دیئے۔ سنبلا کے گلدستے سجا دیئے اور قوس قزح کی قناتیں لگا دیں اور بادلوں کے سائبان لگا دیئے۔ اور شفق کے پردے لٹکا دیئے اور تمام مخلوق سجا دی

اپنے اپنے ترتیب سے آ کے بیٹھ گئی۔ سنگھاسن کے گرد انبیاء بھی اپنی کرسیوں پہ آ کے بیٹھ گئے۔ اور ملائکہ انتظام میں کھڑے ہو گئے۔ اور حوروں نے جنت کے دریچے کھول کر اس محفل کا نظارہ دیکھنا شروع کیا۔ چنانچہ جب ساری محفل جم گئی تو اعلیٰ حضرت نے بڑی جلال و جبروت کی آواز کے ساتھ خطبہ پڑھا۔

"اے آسمان کے رہنے والو!

اے فرشتو!

"قلعۂ معلی شاہی میں پیدا ہونے والے سعادت مند فرزند کا رشتہ آج ہم رحمت اللعالمین کی دختر نیک اختر سے کرنا چاہتے ہیں گویا آج قدرت و رحمت کا جوڑ ہو گا"

اعلیٰ حضرت کی یہ بات سن کر تمام مخلوق سماوی نے کہا:

"خداوندا۔ مبارک ہو۔ اس سے بہتر کیا جوڑ ہو سکتا ہے۔ مگر ہمارا انعام نہیں دیا جائے گا"

اعلیٰ حضرت نے فرمایا:

"ہاں ہاں تمہارا انعام تمہیں ضرور ملے گا۔ مگر جب ملے گا جب بارات لڑکی کے گھر پہنچے گی۔ اور دیکھو! پہلے تم اپنا انتظام کرو کہ تم میں سے کوئی صاحب ہماری طرف سے لڑکی والے کے گھر جائیں اور ہماری طرف سے یہ پیغام دیں کہ ہم آپ سے وابستہ ہو رشتہ چاہتے ہیں۔

اور دیکھو! ہم آج ہی اپنے حکم کی تعمیل چاہتے ہیں محفل ابھی یہاں بھری پڑی ہے بتاؤ تم میں سے کون جائے گا؟

جبرئیل نے بڑھ کے عرض کی۔ "خداوندا۔ میں حاضر ہوں۔"

اعلیٰ حضرت نے فرمایا "جبرئیل! دیکھو۔ ہر بات میں دخل نہ دیا کرو۔"

اپنی حیثیت میں رہو۔ آج تمہارا جانا مناسب نہیں۔ وہ کل بھی کہیں سے اجڑیلا
پہلے بھی آیا کرتا تھا۔ اگر آج آگیا تو کیا ہوا۔ لہٰذا تم بیٹھ جاؤ۔ خیر سے جب
بچے بڑے ہو گئے تو انہیں بہلانے چلے جانا۔ ان کا جھولا جھلانے چلے جانا۔

محترم سامعین!

محفل سیاروں میں سے آفتاب نے عرض کی

"خداوندا۔ چونکہ میں ستیہ نجوم ہوں لہٰذا اجازت ہو تو میں چلا جاؤں اور
شعاعوں کا سہرا پیش کر کے منگنی کی رسم پوری کر دوں!"

قدرت نے جواب دیا۔

"آفتاب! تمہاری عرضی تو قابل قبول ہے مگر یہ خوشی کی تقریب ہے
اور خوشی کی تقریب میں جلنے والے اچھے معلوم نہیں ہوتے لہٰذا تم بیٹھ جاؤ!"

چنانچہ سورج بھی بیٹھ گیا۔ اس کے بعد اعلیٰ حضرت نے چاند سے پوچھا

"کیوں میرے چاند! جاؤ گے!"

چاند نے عرض کی۔

"خداوندا! جانے میں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں مگر جہاں تو مجھے بھیج رہا
ہے۔ وہ تیرے محبوب کا گھر ہے۔ وہاں جو قریب ہے انگلیاں اٹھتی ہیں، ا
میں کٹ جاتا ہوں لہٰذا مجھے وہاں جاتے ہوئے شرم آتی ہے!"

صاحبانِ ذوق!

اعلیٰ حضرت کی نگاہِ انتخاب آخر۔ ستارۂ زہرہ پہ آکے رکی۔

"زہرہ! ہماری طرف سے رشتہ کا پیغام لیکر جاؤ گے!"

زہرہ نے عرض کی: خداوندا! اس سے بڑھ کے اور سعادت کیا
کیا چاہیئے۔ چنانچہ زہرہ نے گلدستۂ پیغام لیکر زمین کی طرف روانگی کا

کیا۔ اللہ ہو کو آتے جو دیکھا تو مرکز عالم و عالمیان نے کہا۔ اللہ اکبر۔ جب تم رو
"بیت النبوی" میں ٹھہرا تو کہا۔ الحمد للہ۔ اور جب پیغام مسرت سے
واپس جاتے دیکھا تو کہا۔ سبحان اللہ۔

بس بھائیو!

یہ فقرے تسبیح جناب سیدہ، موصوف کلمات کی خوشی میں انعام کے طور پر
ملے تاکہ قیامت تک آنے والا ہر مومن اس بارات کی زیارت سے فیض یاب
ہوتا رہے۔

اور یاد رکھو! تسبیح سیدہ تو بن گئی مگر اس وقت تک مکمل نہیں ہوئی جبتک
نماز کے بعد جن کے لئے سیدہ نے۔ دُعا کا وعدہ کیا ہے ان کے لئے
دُعا کرو۔ اور جن کے لئے "بد دُعا" کو کہا ہے۔ اس کے لئے بد دُعا کرو۔
تب جاکے تسبیح سیدہ مکمل ہوتی ہے۔

سامعین کرام!

اعلیٰ حضرت کی طرف سے جب رشتہ مکمل ہو گیا تو محمد نے فرمایا:۔
"یا علیؑ! ہم اپنی لڑکی کا عقد تمہارے ساتھ کرنا چاہتے ہیں۔
علیؑ نے شرم سے سر جھکا دیا۔ اور رسولؐ نے پوچھا۔
"یا علیؑ! میری بچی کا مہر کیا ہوگا؟"
" علیؑ خاموش ہیں۔ سمجھ نہیں آتی کہ اتنے بڑے گھر کی بیٹی کو کیا مہر پیش
کروں۔ آخر عرض کی۔
"قبلہ! میرے پاس جو سامان ہے وہ حضورؐ کو معلوم ہے۔ میرے پاس
صرف ایک گھوڑا، ایک تلوار اور ایک زرہ ہے۔
رسولؐ ہنس کے فرماتے ہیں: یا علیؑ! ان میں سے غیر ضروری شے تمہارے

پاس صرف زرہ ہے لہٰذا اسے بیچ دو۔

بزرگو!

انصاف چاہتا ہوں۔ بتاؤ! کیا ابوطالب کے بیٹے کی جان اتنی سستی تھی۔ خواہ دوسرے اصحاب پھر زرہیں پہن کر میدان جنگ میں جائیں مگر غریب ابی طالب کے بیٹے کے پاس ایک ہی ٹوٹی پھوٹی زرہ تھی وہ بھی بکوا دی۔

رسولؐ جواب میں فرماتے ہیں:

دیکھو نا۔ دوسروں کو زرہ کی ضرورت ہوگی مگر میرا بھائی زرہ وغیرہ کا محتاج نہیں ہے۔ یہ تو صرف رسمی طور پر جنگی لباس پہن لیتا ہے۔ ورنہ علیؑ کو اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

حضرات!

آپ کو تاریخ کے چند جملے سناتا جاؤں جو علیؑ کی زرہ کی تعریف میں لکھے گئے ہیں۔ تاریخ میں تو یوں ہے کہ علیؑ کی زرہ کپڑے کی بنی ہوئی تھی اور اگلی طرف تھوڑا سا لوہا لگا ہوا تھا۔ ایک دن کسی نے پوچھ لیا

یا علیؑ! کپڑے کی زرہ کیوں پہنتے ہو؟

حضورؑ نے فرمایا۔ تاکہ سپاہی کی باضابطہ وردی مکمل ہو جائے!

پھر پوچھا گیا۔

یا علیؑ! زرہ کے سامنے کی طرف لوہا کیوں لگا لیا ہے؟

فرمایا۔ تاکہ سامنے سے لڑنے والا آئے تو لوہا دیکھ لے۔

یا علیؑ! اگر کسی نے زرہ کے پیچھے سے وار کر دیا تو؟

علیؑ نے فرمایا "ابی طالبؑ کا بیٹا اس دن زندہ ہی نہیں رہے گا جس دن دشمن

پشت پر آنے کا موقع دے ۔

بہر نوع علیؑ کی یہ زرہ تھی جس کے لئے رسولؐ نے فرمایا کہ اسے بیچ دو ۔ چنانچہ امیر المومنینؑ نے ایک سو سات روپیہ میں وہ زرہ فروخت کر دی اور پیسے لاکر حضور رسالت مآب کے سامنے رکھ دیئے ۔ حضورؐ نے ان پیسوں میں سے کچھ تو جلدی منگوائی ۔ ایک جوڑا کپڑا منگوا لیا اور باقی کچھ اور سامان ۔ اس کے بعد شہنشاہ ارض و سماء اپنے گھر میں جا کر اپنی بیٹی کے جہیز کا سامان تیار کرنے لگے ۔ اور شام تک جہیز تیار ہو گیا ۔ جب سب کچھ تیار ہو گیا تو مسجد میں بیٹھ کر رسولؐ نے نکاح پڑھا اور کچھ دیر بعد سیدہ کو رخصت کرنے کی تیاری ہونے لگی ۔

ادھر علیؑ نے اپنے کمرے کے فرش کو اس طرح سجایا کہ ایک بکری کی کھال بچھائی جس پر دلدل کو لا کے بٹھاتا تھا ۔ ایک طرف ایک اور بوریا بچھا دیا تاکہ کوئی ملنے والا آئے تو یہاں بیٹھ جائے ۔ اس کے بعد امیر المومنینؑ نے اپنا توشہ ایک کھونٹی پر لٹکا دیا اور دوسری کھونٹی پر آٹا چھاننے والی چھلنی لٹکا دی ۔ اور جب حجلۂ عروسی کی مکمل سجاوٹ تیار ہو گئی تو شہنشاہ ارض و سما کی اکلوتی بیٹی کا جہیز نکلنے لگا ادھر دنیا تماشائی کھڑی ہے کہ اللہ جانے سیدِ عالم اپنی اکلوتی بیٹی کو جہیز میں کیا کیا دیں گے ۔ مگر دنیا نے دیکھا کہ جب جہیز کا سامان برآمد ہوا تو سونے کیلئے ایک بوریا تھا اور اوڑھنے کے لئے ایک چادر تھی ۔ پانی پینے کے لئے مٹی کا ایک گلاس تھا ۔ آٹا پیسنے کے لئے ایک چکی تھی ۔ کچھ چاندی کی چوڑیاں تھیں اور موتی کی رنگیاں تھیں اور ایک مشکیزہ تھا ۔ یہ گویا اس کی بیٹی کا جہیز تھا جس نے عرب کی لاکھوں بیٹیوں کی لاکھوں روپے دے کر شادی کروا دی تھی ۔

بہر نوع شہنشاہ ارض و سما کی اکلوتی بیٹی کا جہیز سروں پر اٹھائے اصحاب چلے ۔ ادھر حضورؐ نے ایک ناقے کے اوپر محمل لگا کر سیدہ کو

اس میں بٹھا دیا اور تمام امہات المومنین کو حکم دیا کہ میری بیٹی کے جلوس
کے پیچھے پیچھے مدحیہ اشعار پڑھتی چلو۔ چنانچہ ام المومنین مدح کے اشعار
پڑھتی ہوئی چلی جا رہی تھی اور رسولؐ زار زار رو رہے تھے " ہائے آج
خدیجہؑ زندہ ہوتی۔ ہائے آج چچا ابی طالبؑ زندہ ہوتے "

بنی ہاشم کی قیادت میں سیدہ کی شادی کا جلوس گذرنے لگا
تو اچانک حضور رسالت مآبؐ نے تمام مسلمانوں میں سے سلمان فارسیؓ کو آواز
دی۔

"سلمانؓ ! ادھر آؤ "

جب وہ پہنچے تو حضورؐ نے ناقے کی مہار سلمانؓ کے ہاتھ میں دیدی۔

حضور والا !

یہ ہے اپنے اقبال کی بات۔ اتنا قدردان ہے یہ خاندان
کہ اگر کوئی ان سے محبت کرے تو یہ اس کا صلہ ضرور دیتے
ہیں۔

بہر کیف۔ شادی کا یہ جلوس رسولؐ کے گھر سے روانہ ہو کر علیؑ
کے گھر میں آگیا۔ اور سیدہ طاہرہ سلام اللہ علیہا کی آج شادی
ہو گئی۔

آج ہم نے اسی شادی کی یادگار کے سلسلے میں ایک عظیم الشان
جلسہ منعقد کیا ہے۔ چراغاں کیا ہے۔ آج ہمارا یوم عید ہے۔ آج ہم ان طعنہ
دینے والوں کو جو کہتے ہیں کہ شیعہ روتے رہیں۔۔ انہیں یہ دکھانا چاہتے ہیں
کہ ہم جیسا جشن بھی کوئی نہیں منا سکتا آج آپ لوگ یہاں آکر بن جائیں اور ہمیں
احساس دربار کا عباسؑ بن جائے اور آج ہم خدا سے فریاد کرتے ہیں۔

اضافۂ شکریہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
خداوند عزّ اسمہ و جل جلالہ کی حمد و ثناء کے بعد حضرات
محمد و آلِ محمد پر درود و سلام

معزز سامعین کرام!

اللہ کی طرف سے انسان کے اندر ودیعت کردہ طاقتوں اور صلاحیتوں کو صحیح کے مطابق عمل میں لانے کا نام "اسلام" ہے۔ گویا اسلام انسان کی کسی طاقت کو معطل نہیں کرتا بلکہ انسانی طاقتوں اور صلاحیتوں کو صحیح طریقے سے استعمال میں لانے کا نام ہی اسلام ہے۔

دیکھو نا! علم لغت یعنی زبان کے اعتبار سے عربی زبان میں طاقت کے کمال کو "ملکہ" کہتے ہیں۔ اب اگر آپ لفظ "ملکہ" کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ سوچیں کہ جب اللہ نے انسان کو پیدا کیا تو تمام ملائکہ کو حکم دیا کہ اس کے تابع ہو جاؤ۔ گویا دنیا کی جتنی قوتیں اور طاقتیں تھیں ان سب کو حکم ہوا کہ تم انسان کے تابع ہو جاؤ۔ لہٰذا تمام طاقتیں انسان کے تابع ہو گئیں۔ صرف ایک نفسِ انسانی کی طاقت تھی جو "شیطان" بن کے باغی ہو گئی۔ اور یاد رکھو ان تمام طاقتوں پر غالب آنے والا "غالب" کہلاتا ہے۔ اور جو اپنے نفس کی طاقت پر غالب ہو جائے وہ "کل غالب" کہلاتا ہے۔ ہر نوعِ انسان تمام طاقتوں کا منبع اور مرکز ہے اور ان تمام طاقتوں کو صحیح استعمال کرنا ہی اسلام ہے

بزرگانِ من! ...... اس تمہید کے بعد میں آپ سے آسان

مقفلوں میں گفتگو کرتا ہوں۔ جہاں ہزاروں طاقتیں انسان میں ہیں وہاں انسان میں یہ بھی ایک طاقت ہے کہ وہ کسی حد پر جا کر رکنا پسند نہیں کرتا۔ آپ یہ دیکھیں کہ انسان چاند پر جا کر رک جائے گا۔ بلکہ چاند پر پہنچ کر بھی کہیں اور جانے کی کوشش کرے گا۔ گویا کسی حد پر نہ رکنا یہ بھی انسان کی ایک طاقت ہے جو انسان کے اندر موجود ہے۔

محترم سامعین!

مثال کے طور پر سمجھاتا ہوں کہ ایک بچہ مجھے کہتا ہے۔

"زیدی صاحب! مجھے نوکری دلوا دو۔"

میں نے پوچھا "برخوردار! کتنی تنخواہ چاہیئے؟"

نوجوان بولا "تقریباً بیس روپے مل جائیں گے تو گزارہ ہو جائے گا۔"

اتفاق سے ہم نے سو روپیہ ماہوار کی نوکری دلوا دی۔ اب جو چند دنوں بعد ہم نے اس نوجوان سے پوچھا۔

"برخوردار! حال کیسا ہے؟" تو کہنے لگا۔

"زیدی صاحب! سو روپیہ میں گزارہ مشکل ہے۔"

بہر طور! ہم نے کسی طرح سے اس کی دو سو روپیہ ماہوار کروا دی۔ مگر اب پھر چند دنوں بعد پوچھا تو یہی جواب ملے گا کہ۔ گزارا مشکل ہے۔ آخر ہم نے ہزار روپیہ کر دیا مگر پھر بھی شکایت کہ گزارا مشکل ہے۔ کیا مجال جو کسی جگہ پہ انسان رکتا ہو۔ آخر ہم نے مشورہ کر کے اسے پورا ضلع دے دیا تاکہ اس کا گزارا ہو جائے۔ لیکن چند دنوں بعد پوچھا کہ بس؟ وہ بولا "نہیں" پھر ہم نے اسے ایک کمشنری دے دی۔ پھر پوچھا بس؟ مگر اس نے پھر اسی نفی میں سر ہلا دیا۔ آخر ہم نے مجبوراً پورا ملک دے دیا۔ لیکن اس کی "نہیں" بدستور قائم رہی۔ اب

ہے۔

آپ چاہے اسے پوری دُنیا دے دیں۔ مگر جب بھی پوچھیں گے وہ یہی کہے گا "ابھی اور" کیا مجال جو اس کی "ابھی اور" ختم ہو جائے۔ لہٰذا اس "اور" کے جذبے نے انسان کو بڑھا چڑھا کے "خُدا" بنا دیا۔ مگر اِدھر انسان ہے کہ خدا بننے کے بعد بھی یہی سوچ رہا تھا کہ اب کیا جون بدلا جائے "موت" آگئی گویا موت نہ آتی تو انسان پھر "اور" بن جاتا۔

سامعین!

آپ یقین فرمائیں کہ فرعون و نمرود پاگل نہیں تھے۔ یہ کوئی احمق نہیں تھے انہیں پتہ تھا کہ ہم خدا نہیں مگر یہ "اور" کا جذبہ تھا جو انہیں خدا بنا رہا تھا۔

یاد رکھو! دو چیزیں انسان کا دماغ خراب کر دیتی ہیں ایک "جذبہ اور" اور دوسرا "پاس بیٹھنے والا" اس لئے کہ اگر بننے والے نے ناجائز بات بھی کہی تو پاس بیٹھنے والے کہہ دیتے ہیں۔

"حضور! بالکل درست ہے۔ حضور! بالکل بجا ہے"

اور بننے والا یہ سمجھتا ہے کہ میں واقعی "بالکل درست ہوں" کیونکہ آدمی میری بات کو درست اور بجا کہہ رہے ہیں

دیکھو نا! بیچارے نمرود و فرعون نے ہزاروں بار لوگوں سے کہا کہ ہم خدا نہیں بن سکتے۔ مگر پاس بیٹھنے والوں نے کہا "نہیں۔ نہیں بننا پڑے گا" آخر وہ بن گئے۔ کیونکہ ان میں "اور" کا جذبہ تو پہلے ہی سے تھا اس لئے وہ لوگوں کے بننے سے فوراً بن گئے۔ بہر کیف یہ انسانوں کی ایک عادت ہے جو کثرت استعمال سے "فطرت" بن جاتی ہے۔ اور انسان کے اندر "ہوس" کا جو مرکز ہے وہ انسان کا "دماغ" ہے اور دماغ کی شکل اپنے پیالے جیسی ہے جیسے چاہے تم سمندر بھر دو مگر خالی ہی رہتا ہے۔ اس لئے انسان "اور" کی رٹ لگاتا

ہے ، اور جب قبر میں جائے گا کیڑے کھا جائیں گے گویا جب انسان پیدا ہوا ہوتے تب اگر "اور" کے جذبے وہ دنیاں تو گرفتاری رہے گا جب تک یہ انسان پیدا موجود ہے ۔

بزرگو! دور دور کی جنگیں، لڑائیاں، مقدمے اور فسادات دنیا میں ہوتے ہیں ان سب کے پس پردہ صرف اور صرف "جذبہ اور" ہے جو انسان کو لڑائی جھگڑوں اور فسادات پر آمادہ کرتا ہے ۔

محترم سامعین!

اللہ نے ایک طرف تو ہمیں فتنہ و فساد سے منع کیا ہے اور دوسری طرف ہم میں "اور" کا جذبہ ودیعت کر دیا ہے گویا سمندر میں پھینک کر کہہ دیا کہ "دامن تر نہ ہونے پائے" ۔ بتاؤ! ہمارا سخت امتحان ہے یا نہیں!

آخر ہم خدا ہی سے پوچھتے ہیں "خداوندا! تو ہی کوئی تدبیر بتا کہ ہمارا "اور" کا جذبہ بھی پورا ہوتا رہے اور دنیا میں فساد و لڑائی بھی نہ ہو"

اللہ جواب میں فرماتا ہے ۔

"سنو! میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ" اگر ایک نعمت کے ملنے پر تم شکر ادا کرو گے تو میں اللہ تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اس میں اور اضافہ کر دوں گا ۔ چونکہ اضافہ میرے ذمہ ہے جتنا میری عطا لا محدود ہے ۔ تمہارا "اور" ختم ہو جائے گا مگر میری "عطا" نہیں ختم ہو گی ۔

صاحبان! اس شکر کے معنی یہ نہیں ہیں کہ شام کو پیٹ بھر کے روٹی کھائی اور لیٹ گئے پیٹ پہ ہاتھ رکھ کے اور کہا "یا اللہ! تیرا شکر ادا کرتا ہوں" لہٰذا صبح کو گوشت عطا فرمائیے گا، حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہے ۔ خدا کی نعمت کا شکر ادا نہیں ہو سکتا ۔ بلکہ اگر تم واقعی خدا کی دی ہوئی نعمتوں کا شکر ادا کرنا چاہتے

ہو تو یوں کرو کہ خدا نے یہ دو آنکھیں جیسی نعمت دی ہیں۔ لہٰذا خدا کی دی ہوئی اس نعمت کا شکر ادا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنی ان آنکھوں کو اللہ کی مرضی کے مطابق عمل میں لاؤ۔ یہ گویا استعمال نعمت کا شکریہ ادا کرنا ہے۔ اسی طرح پیروں سے چلو مگر ادھر جدھر اللہ چلانا چاہتا ہے۔ اسی طرح ہاتھوں سے ضرور کام لو۔ انہیں معطل نہ کرو کیونکہ یہ خدا کی نعمت ہے۔ لہٰذا اسے باندھ کے رکھنا گویا کفران نعمت ہے۔ اب ان ہاتھوں سے کام لو مگر یہ خیال رکھنا کہ جو کام بھی کرو اسے پہلے دیکھ لو کہ کیا اسے اللہ بھی پسند کرتا ہے یا نہیں! اسی طرح اللہ نے انسان کو زبان جیسی شے عطا فرمائی ہے۔ لہٰذا اس نعمت کا شکر ادا کرنے کے لئے ایسے کلمات نکالو جن سے اللہ راضی ہو جائے۔ یہی حالت ہاتھوں کی بھی ہے کہ حلال کماؤ اور حرام سے بچو۔

حضور والا: قرآن مجید کی یہ آیت ہے کہ اگر شکر کرو گے تو نعمت میں اضافہ ہوگا: کس پر نازل ہوئی ہے؟ رسول پر

اب بتاؤ! اس آیت کی تعمیل رسول نے بھی کی یا نہیں؟ یقیناً رسول نے بھی شکر ادا کیا ہوگا۔ اور اللہ نے اپنے وعدے کے مطابق اضافہ بھی کیا ہوگا۔ چنانچہ رسول نے چاروں طرف نظر ڈالی اور دیکھا جتنی نعمتیں تھیں وہ مجھے پہلے ہی مل گئی ہیں اور ان میں اب اضافے کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہی۔ لہٰذا رسول سوچتا ہے کہ اللہ کا شکر ادا کر کے کس شے میں اضافہ کروں۔

میرے بھائیو! رسول کے پاس ایک ایسی نعمت تھی جس کا شکر ادا کر کے وہ اس میں اضافہ کر سکتے تھے، اور وہ تھی۔ **عصمت**۔ چنانچہ رسول نے اس نعمت کا شکریہ ادا کیا مگر زبان سے نہیں بلکہ اپنے عمل سے۔ گویا رسول نے عصمت کو اس شان سے برتا کہ ابھی اعلان رسالت بھی نہیں ہوا۔ مگر دشمن بھی مان گئے کہ تو صادق بھی ہے

اور امین بھی ہے کیوں کہ قول میں عصمت ہو تو صادق ہے اور فعل میں عصمت ہو تو امین ہے۔ لہذا قول و فعل کی عصمت کو صداقت و امانت کہتے ہیں۔

سامعین!

چالیس سال مسلسل نعمتِ عصمت کا شکریہ اس انداز سے ادا کیا کہ کائنات مان گئی، دشمن مان گئے کہ تو صادق بھی ہے اور امین بھی ہے۔ گویا جس نے نعمتِ عصمت کا اتنا شکریہ ادا کیا ہو تو اللہ کو بھی حسبِ وعدہ چاہیئے کہ اس میں اضافہ کرے۔ اللہ نے کہا۔

"محمدؐ! بس۔ میں اپنے اضافے کے وعدہ کو پورا کرتا ہوں لہذا تجھے ایک عصمت عطا کرتا ہوں۔ جس کا نام ہے "**فاطمہؑ**" گویا سیدہ طاہرہ رسولؐ کو شکریہ عصمت کے اضافے میں ملی ہیں۔ لہذا سیدہؑ کی عصمت کی شان اور ہے اور محمدؐ کی عصمت کی شان اور ہے۔

صاحبان! اب آپ کہیں گے کہ عورتوں میں مریمؑ بھی معصوم ہیں۔ میں کہتا ہوں "مریمؑ معصوم ضرور ہے۔ مگر مریمؑ کی عصمت کسی شکریہ میں نہیں ملی تھی۔ وہ تو عطیۂ الٰہی تھا اور اس میں عصمت کی اتنی ہی مقدار تھی کہ ایک پشت چل کر بیٹے تک ختم ہو گئی۔ مگر محمدؐ کے شکریۂ عصمت میں ملی ہوئی عصمت بارہ پشت چل کر آج تک باقی ہے۔ اور قیامت تک باقی رہے گی۔ کیا مجال جو کہیں ختم ہو جائے اور پھر لطف یہ ہے کہ یہ حضرت اللہ نے اس شکریہ عصمت کو عطا کیا تھا کہ اس کی قیامت تک پیدا ہونے والی نسل معصوم تو نہیں ہوگی۔ مگر بے علامت کے شاہ کہلائے گی۔ بغیر سرداری کے سید کہلائے گی۔ دنیا ان کے پیروں کو چھونا باعثِ فخر سمجھے گی۔ اور اگر پیسے پاس ہوں گے تو امیر کہلائیں گے اور اگر کچھ نہیں

ہوا تو فقیر کہلائیں گے اور اگر رہ جائیں گے تو پیر کہلائیں گے یہ گویا شرف تھا بے شکر یعنی
کہ جو عصمت کے شکریے کے طور پر ملی ہے۔

سامعین!

اب رسولؐ چاہتا ہے کہ میں اس نعمت کا شکریہ ادا کر دوں تا کہ اللہ اور اضافہ
کرے۔ چنانچہ رسولؐ نے سیدہ کی عصمت کا یوں شکریہ ادا کیا کہ ایک دن رسولؐ مسجد نبوی
میں منبر پر تشریف فرما کے خطبہ فرما رہے ہیں کہ دیکھا کہ بیٹی چلی آ رہی ہے سیدہ کو دیکھ
کر رسولؐ تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے گویا رسولؐ کا اٹھنا ہی اس نعمت کا شکریہ ادا کرنا تھا
اور قدرت نے رسولؐ کی اس ادا کو دیکھ کر فرمایا۔

محمدؐ! تم نے نعمتِ عصمت کا شکریہ ادا کیا ہے لہٰذا ہم اس نعمت میں اور
اضافہ کرتے ہیں:

چنانچہ اللہ نے ایک نعمت حسنؑ کی شکل میں دے دی۔ گویا فاطمہؑ والے شکریے میں
اضافہ ہو کر حسنؑ والی نعمت ملی۔ اب رسولؐ نے اس نعمت کا بھی شکریہ ادا کر دیا۔
اور وہ اس طرح کہ ایک روز رسولؐ عید کی نماز پڑھنے جا رہے تھے اور حسنؑ کو
کاندھے پر بٹھا رکھا تھا اور اپنی زلفیں حسنؑ کے ہاتھوں میں پکڑا رکھی تھیں اور کہتے
تھے۔ خداوندا۔ دیکھ لے تیری نعمت حسنؑ کا شکریہ ادا کر رہا ہوں۔
گویا شکریۂ نعمتِ حسنؑ جو رسولؐ مجمع عام میں ادا کر رہے تھے۔ اس کو جب اللہ نے
دیکھا تو قدرت کو رسولؐ کی یہ ادا پسند آ گئی

محمدؐ! تو نے حسنؑ کی نعمت کا خوب شکریہ ادا کیا ہے۔ لہٰذا آج ہم
اس میں اضافہ کر کے تمہیں حسینؑ دیتے ہیں

صاحبانِ ذوق!

رسولؐ نے فاطمہؑ کی نعمت کا شکریہ محض تعظیم کر کے اللہ سے حاصل کیا اور

ور حسنؑ کی نعمت کا شکریہ یہ تھا کہ نماز کو جاتے وقت کندھے پہ بٹھا لیا۔ مگر جب حسینؑ
ل نعمت ملی تو شکریہ کا انداز ہی کچھ اور تھا۔ اور وہ یہ تھا کہ

۔ رسولؐ نماز پڑھ رہے ہیں۔ سجدہ میں سر ہے اور پشت پہ حسینؑ کو بٹھا
لیا۔ چونکہ اس شکریہ میں عبادت اور سجدہ دونوں شامل ہیں لہٰذا اب
جو اضافہ ہوگا اس میں سجدہ بھی ہوگا اور عبادت بھی ہوگی۔ گویا
حسینی نعمت کے شکریہ میں جو ملا وہ "سید الساجدین" بھی تھا
اور "زین العابدینؑ" بھی تھا۔

بزرگانِ من!

رسولؐ کو جب سید الساجدینؑ اور زین العابدینؑ والی دونوں نعمتیں مل گئیں۔
و رسولؐ نے اس نعمت کا بھی شکریہ ادا کر دیا۔
اللہ نے کہا "محمدؐ! سنتے بھی ہو۔ اگر چاہو تو اس شکریہ کے عوض ہم تمہیں
محمدؑ نام دے دیں"
چنانچہ محمدؐ کے شکریہ میں محمدؑ مل گیا جس کو ہم محمد باقرؑ کہتے ہیں۔ اس کے بعد
رسولؐ نے پھر کہہ دیا
"یا اللہ! تیرا شکر ہے کہ تو نے مجھے باقرؑ جیسا فرزند عطا فرمایا ہے"
اللہ نے کہا،
"محمدؐ! ہم جانتے ہیں۔ تم نے یہ شکریہ لسانِ صدق سے ادا کیا ہے لہٰذا
ہم تمہیں "صادقؑ" دیتے ہیں۔"
چنانچہ اللہ نے حضور جعفر صادقؑ دے دیا۔ اس طرح رسولؐ کا شکریہ چلتا
جا رہا تھا۔ اور اللہ کا اضافہ بھی چلتا جا رہا تھا۔ آخر چلتے چلتے رسولؐ جب
گیارھویں پہ پہنچے تو اللہ نے اپنے خزانے کا جائزہ لیا۔ دیکھا اور فرمایا۔

"محمدؐ! سنئے بھی۔ گیارھویں تک تو ہم دیتے رہے مگر آج سے بالکل سودا کر لیں۔"

محمدؐ نے پوچھا۔ "خداوندا۔ وہ کیسے؟"

اعلیٰ حضرت نے فرمایا۔

"محمدؐ! آج سے یہ فیصلہ ہو جائے کہ ہمارا "عطیہ" "قائم" رہے اور تمہارا شکریہ "دائم" ہوگا۔"

سامعین!

ایک شخص حضور امام علی نقی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا "فرزندِ رسولؐ! ... وہ امام جو آخری امام ہوگا اور جو "دائم و قائم" ہوگا۔ ذرا اس کی صفت تو بیان فرمائیں۔ چنانچہ حضور امام علی نقی علیہ السلام فرماتے ہیں۔

"اپنے امام کی شان کیا پوچھتے ہو "صاحب الدعوة النبویة وصولة الحیدریة" تمہارا امام اسی طرح دین کی دعوت دیتا ہے جس طرح اس کا جد رسولؐ دعوت دیتا تھا "وصولة الحیدریة" اس کا اصول حیدر کرار جیسا ہے۔ "عصمة الفاطمیة" اس کی عصمت زہرا جیسی ہے۔ "والحلم الحسنیة" حسنؑ جیسا اس کا حلم ہے۔ "والشجاعة الحسینیة" اور حسینؑ جیسی اس کی شجاعت ہے۔

ہر طرح صفت بیان کرتے کرتے جب گیارھویں تک پہنچے تو کہا۔ "والهیبة العسکریة" اور حسن عسکری جیسی اس کی ہیبت ہے۔ تو یہاں آکے آپ نے رک کے اور فرمایا۔

سنو! تم اس کی غیبت پڑھتے ہو؟... والغیبۃ
اللہ جیسی اسی کی غیبت ہے۔

اب بتاؤ! اللہ کسی جزیرے یا غار میں غائب ہے یا کسی مکان میں غائب ہے؟ ہرگز نہیں۔

اللہ تو ہر جگہ ہے اور غائب ہے۔ اسی طرح ہمارا امام خدا کے فضل سے ہر جگہ ہے اور غائب ہے۔ ہم یہ مجالس عزت اپنے امام کو پُرسہ دینے کی غرض سے کرتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ ہر جگہ موجود ہے اور ہم ان کے اور اُن کے آبا کے سامنے اُن کے بزرگوں کے فضائل بیان کرتے ہیں۔

سامعین!

خدا گواہ ہے۔ ہماری ان مجالس کے اصل سامع آلِ محمد ہیں جن کے تصور کی وجہ سے میں نے عمر بھر کبھی بیٹھ کے نہیں پڑھا۔ میرا ایمان ہے کہ میرا مولا موجود ہے اس لئے کھڑے ہو کر پڑھتا ہوں۔ یا وہ بات ہے کہ عارضہ کی وجہ سے پہلے دونوں پاؤں پہ کھڑا ہو کے پڑھتا تھا۔ اب ایک پاؤں پہ کھڑے ہو کر پڑھتا ہوں۔

ہر لمحہ تصورِ آلِ محمد اپنی مجلسوں میں ملحوظِ خاطر رکھتا ہوں۔

بزرگانِ من!

ایک دن کربلا معلی میں ایک عالم بیان فرما رہے تھے کہ جب تم مجلس منعقد کرتے ہو تو اس میں امام عصر والزمان تشریف لاتے ہیں لہٰذا ہمارے خطیبوں، واعظوں اور ذاکروں کو چاہیے کہ وہ بڑی احتیاط کے ساتھ اصل واقعات بیان فرمائیں۔ اور جب تم امام کے سامنے مصائب پڑھو تو بیشک حسینؑ کی شبِ وفات پڑھ دینا علی اکبرؑ کی شہادت پڑھ دینا علی اصغرؑ کی شہادت پڑھ دینا۔ عباسؑ کی شہادت پڑھ دینا۔ عونؑ و محمدؑ کی شہادتیں پڑھ دینا یا امیر قاسمؑ کی شہادت پڑھ دینا

مگر ایک بات کی احتیاط کرتا کیونکہ امامؑ موجود ہوتا ہے لہٰذا ان کی موجودگی میں اپنی دادی زینبؑ کی قید نہ پڑھتا۔ کیونکہ بی بی کی قید سننا امامؑ کے لئے ناقابل برداشت ہے یہ وہ چیز ہے جو آپ کو بے ہوش کر دیتی ہے۔ پھر فرشتے آکر پیر ملتے ہیں۔ لہٰذا میں بڑی احتیاط سے زینبؑ کی قید کا تذکرہ بیان کرتا ہوں۔

سامعین!

میں خود قید ہوا تھا۔ ۲۹ جنوری ۱۹۶۲ء دو بجے رات کا وقت تھا اور تقریباً پانچ سو پولیس کے آدمی مجھے گرفتار کرنے آ گئے۔ سارے محلے کا محاصرہ تھا چھتوں پہ پولیس تھی اور سارا محلہ سہما ہوا تھا کہ اللہ جانے کیا بات ہے جونہی مجھے گرفتار کر کے جب ایک کار میں بٹھایا گیا تو کسی کی آواز آئی ...! ... ایس پی صاحب! ہتھکڑی لگا دوں ...

ایس پی نے کہا۔

خبردار! کیوں شریف آدمی کو پریشان کر رہے ہو...

بس بھائیو!

ایس پی کا یہ کہنا تھا کہ میں نے کہہ دیا۔

... ایس پی صاحب: کاش تم کربلا میں موجود ہوتے اور بجائے یہاں کے وہاں کہہ دیتے کہ کیوں شریف آدمیوں کو پریشان کر رہے ہو

حضرات!

آج سے ایک عرصہ پہلے میرا اپنا خیال تھا کہ مخدراتِ عصمت و طہارت کے ہاتھ باندھنے والی روایت ہم لوگوں نے صرف رونے رلانے کے لئے بنا لی ہے۔ جب میں نے امام زمانؑ کی زیارت ناحیہ پڑھی تو اس میں ہاتھ باندھنے کا ذکر تھا۔ چنانچہ میں نے کہا۔ ٹھیک ہے ضرور بندھے ہوں گے۔

تشویش ہوئی کہ کس طرح بندھے تھے؟ اس کے متعلق بھی امام زمانؑ زیارت ناحیہ میں فرماتے ہیں:-

"میرا سلام ہو میری دادی زینبؑ پر جس کے دونوں ہاتھ اُس کی گردن کے ساتھ بندھے ہوئے تھے۔۔"

بزرگانِ من!

دُنیا میں کوئی ایسی مصیبت نہیں ہے جو زینبؑ پر نہ گذری ہو۔ اسی لئے زینبؑ کو اُمّ المصائب بھی کہا جاتا ہے۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کا فرمان ہے کہ میری دادی پر وہ مصائب گذر گئے کہ جنہیں نہ کوئی سوچ سکتا ہے اور نہ ہی سمجھ سکتا ہے۔

سامعین!

زمانے کا انقلاب دیکھو کہ حیدرِ کرار کی بیٹی یزید کے دربار میں کھڑی ہے۔ اور یزید اپنے نشۂ فتح میں اتنا مشغول ہے کہ قیدیوں سے بات نہیں کرتا۔ اِدھر کھڑے ہوئے قیدیوں میں معصوم بچوں کے پاؤں میں ورم آ گئے تھے اور زمانے کا امام بالکل خاموش کھڑا ہے۔ سیدانیوں کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اور علیؑ کی بیٹیاں، والدہ علی اصغرؑ اور والدہ شہزادہ قاسمؑ سر جھکائے خاموش کھڑی ہیں۔

تھوڑی دیر بعد زینبؑ نے امام زین العابدینؑ سے کہا۔

بیٹا! میری بھاوجیں کھڑی ہوئی ہیں اور ان کے میلے کے لوگ کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ وہ کیا کہتے ہوں گے کہ ہماری لڑکیاں کس خاندان سے بیاہی گئی ہیں۔ بیٹا! مجھے شرم آ رہی ہے۔

اس کے بعد زینبؑ کا وہ تاریخی فقرہ آج بھی فضا میں گونج رہا ہے کہ جب سیدانیوں کو دربارِ یزید میں کافی دیر کھڑے رہنا پڑا تو زینبؑ کے

منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَکْرَمَنَا۔"

خدایا! ہم تیرا شکر ادا کرتے ہیں
جس نے ہمیں یہ عزت عطا کی۔

سامعین!

کوئی اور ہوتا تو کہتا۔

"واہ اللہ! ہم کس طرح تیرا شکر ادا کریں۔ کیونکہ تیرے نام پر ہم مر گئے اور تو نے ہماری خبر بھی نہ لی۔ ہمارے بچوں کو ذبح ہوتے دیکھتا رہا مگر کچھ مدد نہ کی"۔

مگر

وہاں تو زینبؑ نے اللہ کا شکر ادا کر کے دُنیا کو یہ بتا دیا کہ۔

"خدا ہے"

اور یہ خدا کا بڑا احسان ہے کہ آج دُنیا خدا کو مان رہی ہے۔ اب اگر خدا کا یہ وعدہ ہے کہ:

"اگر تم شکر ادا کرو گے تو میں زیادہ دوں گا"

تو بتاؤ!

زینبؑ کے اس شکریہ پر
قدرت کیا اضافہ
فرماتی ہے۔؟

قانونِ عدل نمبر ۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خداوند عزاسمہ و جل جلالہ کی حمد و ثناء کے بعد حضرات
محمد و آلِ محمد پر درود و سلام

حضرات گرامی قدر!

اللہ تعالیٰ کا منشا یہی ہے۔ اللہ کی مشیت یہی ہے اور اللہ چاہتا یہی ہے کہ انسان ہر حالت میں قانونِ عدل پر قائم رہے اور عدل سے منحرف نہ ہونے پائے دوسرے لفظوں میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ انسان کو وہی کرنا چاہیئے۔ جو کرنا چاہیئے گویا کوئی بات اللہ کی "چاہیئے" کے خلاف نہیں ہونا چاہیئے یہی اللہ کا منشاء ہے اور یہی اس کی مرضی ہے۔ اگر انسان قانونِ عدل پر قائم نہ رہے تو اللہ کا کچھ بگڑتا نہیں۔ اور اگر دنیا کے تمام انسان قانونِ عدل پر قائم ہو جائیں تو اللہ کو کچھ ملتا نہیں۔ اللہ ہر طرح اللہ ہے۔ چاہے ساری دُنیا اللہ اللہ کرے۔ تب اللہ ہے اور اگر ساری دُنیا اللہ سے منکر ہو جائے۔ اللہ پھر بھی اللہ ہے۔

سامعین!

ابھی تک تو کوئی انسان دنیا میں ایسا پیدا ہوا ہی نہیں جو اللہ کے وجود کا منکر ہو۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ "ہم اللہ کو نہیں مانتے" اُن کا یہ کہنا "ہم اللہ کو نہیں مانتے" سے مراد یہ ہے کہ کوئی اللہ ہے جس کے وجود سے وہ منکر ہیں۔ ورنہ اگر اللہ نہ ہوتا تو "نہ ماننا" کبھی سامنے نہ آتا۔ بہرکیف کوئی انسان اللہ کے وجود سے منکر نہیں ہے۔ بلکہ ہر انسان کسی نہ کسی طرح سے اللہ کے وجود کا اقرار کرتا ہے اور اگر کوئی نہ مانے تو اس سے اللہ کا کچھ نہیں بگڑتا بلکہ وہ

تو یہ کہتا ہے کہ:

• انسانو! قانونِ عدل پر قائم رہو۔

بزرگانِ من!

سب سے پہلی عدالت، اللہ ہم سے یہ چاہتا ہے کہ ۔

• انسانو! میں نے تمہیں انسان پیدا کیا ہے۔ لہٰذا پہلا عدل یہ ہے کہ تم انسان بن کے رہو۔

حضرات! اگر اللہ ہمیں انسان کی بجائے کچھ اور بنا دیتا تو ہماری کوئی زبردستی تھی؟۔ یہ تو اللہ کا ہم پر بڑا فضل و کرم ہے کہ اس نے ہمیں انسان پیدا کیا ہے!

بچو! اب تم پوچھو گے کہ انسان کچھ اور کیا بن سکتا ہے؟

میں کہتا ہوں، بہت زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ دیکھو نا۔ انسان کے دائیں طرف ایک فرشتہ ہے اور بائیں طرف ایک حیوان۔ اب اگر انسان چاہے تو حیوان بن جائے اور چاہے تو فرشتہ بن جائے۔

گویا فرشتہ بننا بھی کوئی مشکل نہیں اور حیوان بننا بھی کوئی مشکل نہیں۔ بلکہ انسان کا انسان بننا بڑا مشکل کام ہے۔

سامعین!

حیوان بننے میں کیا مشکل ہے۔ طریقہ میں بتائے دیتا ہوں۔

دیکھو نا!

انسان کو بھی بھوک لگتی ہے اور حیوان کو بھی بھوک لگتی ہے۔ انسان کو بھی خوراک چاہیئے اور حیوان کو بھی خوراک چاہیئے۔ لہٰذا دونوں اپنی بھوک میں خوراک مانگتے ہیں۔ مگر فرق یہ ہے کہ حیوان کو جب بھوک لگتی ہے۔ رسّہ توڑ دیا اور گھر سے چلا۔ رستے میں جو شے کھانے کی نظر آئی۔ کھالی مگر یہ نہ دیکھا کہ اپنی ہے یا پرائی ہے۔

اس کا کھانا مناسب ہے یا نامناسب ہے۔ اس کا کھانا جائز ہے یا ناجائز!
بہر طرح اپنا پیٹ بھر لیا۔

گویا جو پیٹ بھرتے ہیں، جائز و ناجائز کی پرواہ نہ کرے۔ اسے "حیوان" کہتے ہیں اور جو یہ سوچ لے کہ یہ مناسب ہے یا نہیں! جائز ہے یا نہیں؟ اسے کھانا چاہیئے یا نہیں؟ اگر پرائی ہے تو بھوکا رہنا بہتر ہے۔ ایسے جائز و ناجائز کی پرواہ رکھنے والے کو "انسان" کہتے ہیں۔

اب بتاؤ! حیوان بننا آسان ہے یا انسان بننا مشکل ہے!
بہر طرح آپ اگر حیوان بننا چاہیں تو بن سکتے ہیں اور اگر فرشتہ بننا چاہیں تو اس کے لئے بھی کوئی دشواری نہیں ہے۔

دیکھو نا! اگر آپ چاہیں تو ابھی فرشتہ بن سکتے ہیں کیونکہ فرشتے وہ ہیں جو نہ کھاتے ہیں اور نہ ہی محنت کرتے ہیں۔ جو نہ مزدوری کرتے ہیں اور نہ ہی کسی کی پرواہ کرتے ہیں۔ بس آپ بھی یہی کام شروع کر دیں کہ ایک لمبا سا کرتا پہنیں۔ وہ بھی کالا۔ چمٹا ہاتھوں میں لے لیں۔ سال بھر چاہے ست دھوئیں، تیس سال غسل نہ فرمائیں، ناخن بڑھے ہو جائیں۔ بال لمبے ہو جائیں۔ کرتا میلا ہو جائے۔ رات کو سونے کی جگہ نہ ہو۔ کھانا بالکل چھوڑ دیں۔ کھانے کی فکر نہ ہو تو سب دیکھنے والے یہی کہیں گے "بندہ کیا ہے، فرشتہ ہے۔"

میں پوچھتا ہوں "بھئی! تمہیں کیسے پتہ چلا کہ یہ بالکل فرشتہ بن گیا؟"
"زیدی صاحب! تمہیں کیا معلوم ہے، آپ کبھی فرشتہ بن کر تو پتہ چلے۔"

ادھر زیدی صاحب نہ کبھی فرشتہ بنیں گے اور نہ ہی پتہ چلے گا۔ اُدھر فرشتے صاحب ہیں کہ سارا دن سڑکوں پہ مارے مارے پھرتے ہیں اور رات کو کسی دکان کے تھڑے پہ لیٹ گئے۔ سردی کا موسم۔ رات بھر گلے والوں کو جگایا اور جب کبھی پڑھا

کیا بد تمیزی ہے تو لوگوں نے کہا۔ عبادت کر رہا ہے۔ بہر حال اسے فرشتے
لگتے ہیں۔ اب اگر تم میں سے کوئی بننا چاہے تو بے شک بن جائیے۔

بچّو!

مجھے بھی لوگ اکثر یہ کہہ دیتے ہیں۔ زیدی صاحب! سبحان اللہ۔ آپ تو
فرشتہ ہیں۔ ادھر زیدی صاحب بھی اکڑ جاتے ہیں کہ میں فرشتہ بن گیا ہوں حالانکہ
لوگوں کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ زیدی صاحب فرشتہ تو ہیں مگر ان میں انسانیت نہیں
ہے۔ یاد رکھو! حیوان بننا بھی بڑا آسان ہے اور فرشتہ بننا بھی بڑا آسان ہے
مگر یہ دونوں باتیں انسان کو قانونِ عدل سے ہٹا دیتی ہیں۔ لہٰذا قانونِ عدل کا تقاضا
یہی ہے کہ تم انسان ہو اس لئے انسان ہی کے رہو۔ کیا مجال جو تمہاری انسانیت میں
فرق آ جائے تمہارا ہر قول و فعل قانونِ عدل پہ قائم رہنا چاہیئے برادری کے معاملات
میں بھی اور اللہ کے معاملات میں بھی تم قانونِ عدل پہ قائم رہو۔ جس طرح اللہ کہتا ہے "نماز
پڑھو"۔ لہٰذا تم بھی نماز پڑھو۔ اللہ کہتا ہے "روزہ رکھو"۔ لہٰذا تم بھی روزہ
رکھو۔ اللہ کہتا ہے "کسی کا مال نہ کھاؤ"۔ لہٰذا تم بھی غاصب نہ بنو۔ اللہ کہتا ہے۔
"کسی پریشان کو دیکھو تو مدد کرو" یہ فرقِ عدل ہے لہٰذا تم اس پر بھی قائم رہو۔ گویا یہی قانونِ عدل
ہے کہ انسان انسان ہی کے رہے۔ چاہے وہ ذاتی معاملہ ہو۔ یا معاشرتی معاملہ ہو۔ چاہے
بندوں کا معاملہ ہو یا اللہ تک پہنچنے کا معاملہ ہو بہر صورت تمہیں ہر حالت میں قانونِ عدل
پر قائم رہنا چاہیئے۔

سامعین!

اللہ کے معاملے میں انسان بڑا ظالم واقع ہوا ہے۔ کیونکہ اگر انسان، انسانوں پہ ظلم
کرے تو یہ ڈر رہتا ہے کہ انسان جواب دے گا۔ مگر اللہ کے بارے میں انسان جانتا
ہے کہ وہ رحیم و کریم ہے لہٰذا معاف کر دے گا۔ بہر کیف اللہ کے معاملے میں انسان بہت

ظالم واقع ہوا ہے۔ انسان کو جہاں بھی موقع ملتا، وہ ظلم کرتا رہا۔ کہیں کہہ دیا اللہ دو ہیں۔ کہیں کہہ دیا، تین ہیں۔ بہرحال اللہ کے معاملے میں انسان بڑا ظالم واقع ہوا ہے۔

بچو!

اگر میری بات پہ یقین نہ آئے تو ہمسایہ ملک (ہندوستان) میں جا کے دیکھ لو، وہاں تقریباً ساٹھ کروڑ پوجنے والے ہیں اور وہ سب مشرک ہیں۔ گویا ایک ایک بندے کے حصے میں تین تین "اللہ" آتے ہیں۔ مثلاً "پیپل" "اللہ" ہے، "گائے" اللہ ہے، گنگا اللہ ہے، وغیرہ وغیرہ۔

بچو! تم تو ابھی بچے ہو، ان بزرگوں سے پوچھو جو ہندوستان سے آئے ہیں، وہ بتائیں گے کہ ساٹھ کروڑ عوام گنگا کو "گنگا ماتا" کہتا ہے، ادھر گنگا ہے کہ پھولی نہیں سماتی۔ لیکن ذرا دیکھو، کروڑوں انسان جو "ماتا" کہہ رہا ہے۔

یاد رکھو! ایسی باتیں بہت اکڑتی ہیں جو صحیح نہ ہوں۔ بہرحال دنیا نے گنگا کو جب "ماتا" کہہ دیا تو گنگا کے ہوش اڑ گئے، آپ میں نہ رہی۔ ادھر گنگا ہے کہ پھولی نہیں سماتی کہ مجھے "ماتا" بنا بیٹھے ہیں، اس سے بہتر اور کیا چاہیے۔ ہر سال دو سال تو خیریت سے اپنے کناروں کے اندر رہتی بہتی رہی اور جب تیسرے سال غصہ چڑھا تو کناروں سے باہر نکل پڑی اور سیلاب آ گیا۔ اب بچے ڈوب کر مر رہے ہیں۔

"ماں! دیکھو، ہم تیرے ہی بچے ہیں۔ ہمیں کیوں ڈبو رہی ہو؟"
مگر ماں ہے کہ کسی کی سنتی ہی نہیں۔ اور ادھر بچے ہیں کہ کہاں پکار رہے ہیں: "ماں! خود جانے بھی دو، ہم بچے چاروں پہ

دم کرو۔ مگر اماں کسی کی سنتی ہی نہیں کیونکہ کناروں کے اندر رہتے
تو دم کرے۔

بزرگو!

انگریز قوم بڑی ہوشیار تھی۔ انہوں نے سوچا کہ "اماں" بن کے بے کار بیٹھی ہے اور یہ بے کاری کا نتیجہ ہے کہ چلو اور نہیں تو کناروں سے ہی باہر نکل پڑو۔ اللہ اماں کو مصروف رکھنے کے لئے انہوں نے جگہ جگہ سے نہریں نکال دیں اور چکیاں لگا دیں۔ اب جو اماں کو چکی پیسنا پڑی۔ تو بگڑا ہوا دماغ ٹھیک ہو گیا۔ پھر نوع انسان نے ہزاروں اللہ بنا کے بٹھا دیئے۔ اب اگر میں آج تمام اللہ وؤں کی فہرست بیان کرنا شروع کر دوں تو پورا عشرہ گذر جائے گا۔ مگر اللہ ختم نہیں ہوں گے۔

سامعین!

ہم نے چاروناچار عقل و علم کے مطابق فیصلہ کیا کہ بالکل غلط، ہزاروں اللہ وؤں کے در در کے دھکے کھانے سے تو بہتر ہے کہ ایک ہی باپ کریم پہ بیٹھ جائیں۔ یہی عین شرافت ہے اور یہی تقاضۂ انسانیت ہے۔ ہم مسلمان ہیں اور ہمارے کلمہ میں پہلی چیز ہی یہی ہے کہ "لا إله إلا الله" "اللہ ایک ہے۔"
دیکھنے میں تو یہ دو لفظ ہیں "لا إله إلا الله محمد رسول الله" مگر اتنے قیمتی ہیں کہ بڑے سے بڑا دشمن بھی ان میں "نکتہ" نہیں لگا سکتا اور پھر ان میں جو طاقتیں اور وسعتیں ہیں ان کا کوئی شمار ہی نہیں کر سکتا۔
کلمہ میں طاقتیں آئی ہیں کہ جو جہنمی تھا۔ پڑھ دیا تو جنتی ہو گیا۔ نجس تھا۔ پاک ہو گیا۔ غیر تھا۔ اپنا ہو گیا۔ دور تھا۔ قریب ہو گیا۔ گویا یہ کلمہ اتنی طاقتور شے ہے۔

بزرگو! تمہاری عمر گذر گئی یہ سنتے سنتے کہ دنیا میں اگر کوئی طاقتور شے ہے

آرہ ۔۔ ذوالفقارِ حیدرِ کرار ہے ۔ اور جب تلوار اتنی طاقتور ہے تو اس کو چلا
والے کی طاقت کا تو کوئی اندازہ ہی نہیں لگایا جا سکتا۔ گویا علیؑ تو ہے ہی مرکزِ طاقت
علیؑ کے نام میں طاقت ہے۔ علیؑ کے نام میں طاقت ہے۔ انسان ذرا سا گھبرا جائے
اور علیؑ کا نام لے لے تو بدن میں طاقت آ جائے گی۔ گویا علی بہترین نسخہ ہے
علیؑ بہترین کیمیا ہے۔ علی بہترین اکسیر ہے۔ بہر نوع علیؑ کے نام میں بڑی قوت
ہے۔

دیکھو نا!

جب مغربی پاکستان میں ۱۹۶۵ء میں جنگ ہوئی تھی، ان دنوں میں لاہور
میں تھا اور لاہور محاذِ جنگ تھا۔ ایک رات ۲ بجے کے قریب تمام شہر اور محلے بھر سے
دکانوں اور مکانوں کی چھتوں سے۔ یا علیؑ۔ یا علیؑ۔ کی آوازیں آنے لگیں۔ میں حیران
و پریشان تھا کہ آخر بات کیا ہے۔ آج ۔یا علیؑ۔ یا علیؑ۔ کیوں ہو رہا ہے ؟ ۔
چنانچہ گھر سے نکلا اور دیکھا کہ بڑے بڑے بزرگانِ دین چھتوں کی روشنی میں یا علی
کہنے کو بہت کہہ رہے تھے۔ آج پوری آواز سے ۔یا علیؑ۔ کہہ رہے ہیں۔ میں حیران
و پریشان کہ آج یا علیؑ کا ورد زور دار کیوں ہو گیا۔ آخر کار یہی سوچتا ہوا گھر آیا اور سو گیا
مگر نیند کیسی کہ آتی ادھر بلیک آؤٹ اور بھائی جہاز بم برسا رہے ہیں اور ادھر ۔یا علیؑ
۔یا علیؑ۔ کہنے والوں نے پریشان کر رکھا ہے۔ بالآخر سوچا کہ دن چڑھے پوچھوں گا کہ
کیا بات ہے۔

بچو!

میں نے ایک گھوڑا پال رکھا تھا جسے بڑے پسینے سے محنت کر کے سکھایا تھا
نبی جی چودری بھیجو۔ بس اور کچھ نہیں جانتا تھا سوائے اس کے کہ ۔۔
۔۔ نبی جی چودری بھیجو۔۔ ادھر میں رات کو اس کی سواری میں بیٹھا ہوا تھا کہ خدا دشمنا!

آج "یا علیؑ۔ یا علیؑ" کہیں ہو رہا ہے کہ اسی اثناء میں طوطے نے بھی بولنا شروع کر دیا۔ مگر "بی بی جی چوری بیچ جیں۔ مٹھ "نیں۔ نیں" کہنا شروع کر دیا۔ وہی اپنی اصل بولی بولنا شروع کر دی۔ میں نے بستر پہ بیٹھے ہوئے پوچھا

"طوطے میاں! آج سکھائی ہوئی بات بھول گیا اور اصل بات کہنا شروع کر دی۔ آخر کیوں!"

یہ کہہ کر جو میں نے دیکھا کہ بلی نے طوطے کے پنجرے پہ حملہ کیا ہوا ہے۔ اب پتہ چلا کہ امن و امان ہو تو سکھائی ہوئی باتیں کہی جاتی ہیں اور حملہ ہو جائے تو اصل بات خود بخود منہ سے نکل جاتی ہے۔

بہرنوع "یا علیؑ" کہنے میں بڑی طاقت ہے۔ علیؑ بڑی طاقت والی شے ہے، علیؑ بڑی قوت والی شے ہے۔ علیؑ کے نام میں طاقت ہے۔ علیؑ کے کام میں طاقت ہے اور پھر علیؑ کی تلوار تو ہے ہی مرکز طاقت۔

کیوں سامعین!

اگر علیؑ کی تلوار پوری طاقت سے چل پڑے تو بتاؤ! خیبر کے در سے رکتی ہے؟ مرحب کے سر سے رکتی ہے؟ خیبر و مرحب کو چھوڑ و بلکہ یہ بتاؤ! جبرئیل کے پر سے رکتی ہے؟ نہیں نہیں۔ گویا علیؑ کی تلوار اتنی طاقت ور شئے ہے۔

اب بتاؤ۔ جس تلوار کی طاقت کو کوئی شئے نہیں روک سکتی تھی اس کی طاقت کو لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ روک دیتا تھا یا نہیں؟ ادھر سے علیؑ کی تلوار چلی اُدھر سے شمنِ کے منہ سے کلمہ نکلا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ تلوار فوراً رک جاتی تھی۔ گویا علیؑ کی تلوار کو جو شئے روک سکے وہ ہے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ۔

یاد رکھو! چاہے بے دلی سے ہو۔ چاہے صرف زبان سے ہو۔ اگر سامنے

سامنے نے کہدیا، لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه ۔ تو علیؓ کی تلوار رک جاتی تھی ۔
بہر حال علیؓ کی تلوار اتنی طاقت ور ہونے کے باوجود کلمے کے سامنے رک جاتی تھی : لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۔ ہمارا کلمہ ہے اور یہی قانون عدل ہے کہ ۔ اَللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْكَ ہے ۔

صاحبان!

مسلمانوں کی سب سے بڑی قسم اگر کوئی شے ہے تو وہ کلمہ طیبہ ہے ۔ اگر کلمہ پڑھ کے کوئی مسلمان بات کہدے تو دوسرے مسلمانوں کو ماننا پڑتی ہے ۔ گویا اتنی بڑی مقدس قسم ہے ۔ قسم جلالی ۔

بچو! ہمارے پنجاب میں تو یہ طریقہ ہے کہ اگر کسی چور کو چوری کے جرم میں پکڑ لیا جائے اور وہ کلمہ پڑھ کے کہدے کہ میں نے چوری نہیں کی تو لوگ اُسے چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ آدمی کلمہ پڑھ کے جو کہہ رہا ہے ۔ اب اگر اس کی بات نہیں مانیں گے تو ہم مسلمان نہیں رہیں گے گویا کلمہ کوئی طاقتور شے ہے کہ اگر کلمہ پڑھ کے کوئی بات کہدی جائے تو مسلمانوں کو ماننا پڑے گی اور اگر نہیں مانیں گے تو ہم مسلمان نہیں ہوں گے

یہی بات ہے حضور والا!

ہمارا بچہ ہو یا بوڑھا ۔ جوان ہو یا بڈھا ۔ جاہل ہو یا عالم ۔ امیر ہو یا غریب رئیس ہو یا تاجر ۔ گویا ہم میں سے ہر ایک سے گھر میں بازار میں مسجد میں کعبہ میں ۔ جہاں چاہو کہلوا لو ۔ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ہم کلمہ پڑھ کے کہتے ہیں ۔ مسلمان ہو تو ماننا پڑے گا ۔ مومن ہو تو یقین کرنا پڑے گا کہ ۔ علیؓ وَلِیُّ اللّٰه ۔

سامعین!

ہم پر تو خواہ مخواہ الزام لگایا جاتا ہے کہ ہم نے ۔ علی ولی اللّٰه ۔ کو جوڑ کر

مانیا ہے حالانکہ ہم تو کلمہ پڑھ کے اعلان کرتے ہیں۔ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ مسلمان ہو تو ماننا پڑے گا مومن ہو تو یقین کرنا پڑے گا کہ۔ علی ولی اللہ۔۔۔ اب اگر نہیں مانوگے تو تمہارا اسلام خطرہ میں پڑ جائے گا۔ کیونکہ کلمے سے بہتر اور کوئی سعادت ہو سکتی ہی نہیں۔ اس سے زیادہ اعلان کی کوئی اور شان ہو سکتی ہی نہیں

اب تم اس جھگڑے میں مت پڑو۔ کہ۔ علی ولی اللہ۔ جزو کلمہ ہے یا نہیں!

میں کہتا ہوں کہ جزو کلمہ تو کیا شے ہے بلکہ علی ولی اللہ تو روح کلمہ ہے۔ اب اگر چاہو تو روح کو کلمے سے نکال دو۔

مگر یاد رکھو! تمہیں اس بات کا اختیار نہیں ہے۔ کیونکہ روح کے بغیر تم بھی مسلمان نہیں رہ سکتے۔ لہٰذا یہی بہتر ہے۔ چاہتے ہو تو کلمہ اور روح دونوں کو ہمیشہ یاد رکھو۔ اس لئے کہ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔

بزرگان من!

قانون عدل پر قائم رہنے کے لئے سب سے پہلے ہمیں خدا کے بارے میں قانون عدل پر قائم رہنا پڑے گا کہ وہ وحدہٗ لاشریک ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں کسی کی طاقت ہی نہیں کہ اس کا کوئی شریک ہو جائے۔ کسی کی مجال ہی نہیں کہ اس کا شریک ہو جائے۔ ایسا ہو سکتا ہی نہیں کہ اس کا کوئی شریک ہو جائے۔

اور یہ عین عدل ہے اللہ کے ساتھ کہ اللہ وحدہٗ لاشریک ہے۔

اور یاد رکھو! خود اللہ اس بات کا گواہ ہے کہ وہ وحدہٗ لاشریک اور وہ صاحبان علم اللہ کے وحدہٗ لاشریک ہونے کے گواہ ہیں جو۔ قائم بالقسط۔ "عدل پر قائم ہیں"

سامعین! اللہ نے یہ نہیں کہا کہ جو عدل کرتے ہیں بلکہ فرمایا "قائما بالقسط"۔۔ جو عدل پر قائم ہیں۔

اور یاد رکھو! "عدل پر قائم" ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ان کا قول و فعل و عمل عدل کے خلاف ہو سکتا ہی نہیں۔ "ہوتا نہیں" نہیں بلکہ "ہو سکتا ہی نہیں"۔ گویا جن کو ہم اصطلاح میں "معصوم" کہتے ہیں ان کو قرآن "قائم بالقسط" کہتا ہے۔ ہر طرح ان معصومین کا کوئی قول و فعل و عمل عدل کے خلاف ہو سکتا ہی نہیں۔

بچو! یہ بتاؤ۔ معصومین کتنے ہیں! "چودہ"

دیکھو! ان چودہ کے علاوہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء بھی معصوم ہیں فرق صرف یہ ہے کہ چودہ اور شان کے معصوم ہیں اور انبیاء اور شان کے معصوم ہیں یہ چودہ جو بھی کرتے ہیں ٹھیک ہوتا ہے اور یہ انبیاء بھی جو کرتے ہیں ٹھیک ہوتا ہے۔ باقی فرق یہ ہے کہ انبیاء معصوم وہی کرتے ہیں جو ٹھیک ہوتا ہے گویا پہلے وہ دیکھ لیتے ہیں کہ ٹھیک ہے۔ پھر کرتے ہیں لیکن یہ چودہ جو کر دیں ٹھیک ہوتا ہے گویا یہ چودہ پہلے "ٹھیک" تلاش نہیں کرتے بلکہ جو کر دیں وہ ٹھیک ہوتا ہے ان کے منہ سے جو بات نکل جائے وہ پوری ہو جاتی ہے۔ جو ان کا عمل ہو جائے وہ پورا ہو جاتا ہے۔ گویا۔ "ٹھیک" ان "چودہ" کے تابع ہے اور انبیاء ٹھیک کے تابع ہیں۔ ان "چودہ" کو ضرورت نہیں کہ پہلے ٹھیک تلاش کریں بلکہ جو کر لیا وہ ٹھیک ہے۔

کیونکہ

انہوں نے اپنی مرضی اور خواہش اس طرح خدا کے سپرد کر دی ہے یہ وہی چاہتے ہیں جو خدا چاہتا ہو۔ یہ وہی کرتے ہیں جو خدا چاہتا ہو اور جب ان کا قول و فعل مشیت الٰہی ہے تو پھر ان کے کسی حرکت و سکون میں غلطی ہو ہی نہیں۔

کیوں علمائے کرام!

بتاؤ۔ آلِ محمدؐ نے کبھی کوئی ایسا عمل کیا ہے جو خدا کی مرضی کے خلاف ہو۔؟

ہرگز نہیں۔

مولانا! اتفاقاً اگر کبھو ملا تاریخ کا طالب علم ہونے کی حیثیت سے ہو۔ غیر جانب دار مبصر کی حیثیت سے کہو کہ کیا آلِ محمدؐ کے بڑے سے بڑے دشمن نے بھی یہ بتایا ہے کہ ان کا عمل قول و فعل خدا کی مرضی کے خلاف تھا؟

ہرگز نہیں۔

سنی بھائیو!

اسی لئے ہم دعا کرتے ہیں۔ خداوندا۔ قیامت کے دن آلِ محمدؐ سے ہمارا واسطہ ہو جائے کیونکہ دنیا میں محمدؐ و آلِ محمدؐ نے وہی کچھ کیا جو اللہ نے چاہا۔ لہٰذا قانونِ عدل کا تقاضا یہ ہے کہ جب دنیا میں محمدؐ و آلِ محمدؐ نے وہی کیا جو اللہ نے چاہا تو قیامت میں اللہ بھی وہی کرے گا جو محمدؐ و آلِ محمدؐ چاہیں گے۔ یعنی جسے محمدؐ و آلِ محمدؐ چاہیں گے وہ جنت میں جائیں گے اور جسے محمدؐ و آلِ محمدؐ نہیں چاہیں گے وہ جہنم میں جائیں گے۔

سامعین!

وعدہ کرو کہ قیامت کے دن مجھے پہچانو گے۔ دیکھو! ایمان کا رشتہ ایسا رشتہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کو پہچان لیں گے اور پھر قیامت کے دن تو لطف بھی بڑا ہی آئے گا۔ تم بھی حیران ہو جاؤ گے کہ جب قیامت کے دن تمام دنیا اکٹھی ہو جائے گی۔ وہاں مسلمان بھی ہوں گے یہودی بھی ہوں گے۔ ہندو بھی ہوں گے عیسائی بھی ہوں گے۔ غرض ہر فرقہ اپنی اپنی ٹولی میں خوش کھڑا ہوگا کہ اچانک ایک

آواز آئے گی۔

- مسلمانو! جاؤ، جنت میں۔

ادھر مسلمان بھی جب خوشی میں جنت کی طرف بھاگنا شروع کریں گے تو سامنے جنت کا دروازہ دکھائی دے گا۔ اب جو مسلمان وہاں پہنچیں گے تو بقول شاہ ولی اللہ دہلوی کہ جنت کے صدر دروازے پر جہاں سے تمام مسلمان جنت کے اندر جائیں گے وہاں لکھا ہوگا۔

- محمدؐ۔ علیؑ۔ فاطمہؑ۔ حسنؑ۔ حسینؑ۔

اب جو بڑے بڑے بزرگان دین اور محافظ اسلام اپنی ریش مبارک سیدھے ہوئے ان ناموں کو دیکھیں گے تو فوراً رک جائیں گے۔

ہم پوچھیں گے۔ حضرات! بات کیا ہے۔ اندر کیوں نہیں جاتے؟

وہ کہیں گے۔ نہیں جاتے۔

- آخر کیوں؟

اب وہ بڑے ہی غصہ میں فرمائیں گے۔۔ دیکھتے نہیں ہو! یہ امام باڑہ ہے۔۔ بہر نوع ہم خوش کھڑے رہیں گے اور حضرات سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوں گے کہ یہ تو امام باڑہ ہے۔ وہ جنہیں امام باڑہ میں جانے کی عادت ہے انہیں فرشتے لاکھ روکتے رہیں گے مگر وہ یہی کہیں گے کہ: ابھی ٹھہرو۔ ہم مجلس سن کے ابھی آتے ہیں: انشاء اللہ ہم اسی شان سے جنت میں جائیں گے۔ جس طرح امام باڑوں میں آتے ہیں۔

بہر کیف محمدؐ و آلِ محمدؐ ہی قانون عدل پر قائم تھے اور تقاضائے عدل بھی یہی ہے کہ وہ بھی طرح جائیں گے۔ قدرت کی طرف سے یہی ہوگا جہاں کی بہشتی ہوگی۔

محترم سامعین!

یوں تو انسان ہر حالت میں قانونِ عدل پر قائم رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر تین مواقع ایسے ہیں جہاں انسان قانونِ عدل سے ہٹ جاتا ہے اور وہ ہیں محبت طیش اور عیش۔ گویا ان تین مواقع پہ انسان قانونِ عدل سے ہٹ جاتا ہے۔ ایک تو محبت کی انتہا میں ایک طیش کی انتہا میں اور ایک عیش کی انتہا میں۔ کیونکہ محبت بھلا دیتی ہے اچھے و برے کو۔ طیش بھلا دیتا ہے نیک و بد کو اور عیش بھلا دیتا ہے اپنے و پرائے کو۔ بہر طور انسان وہ ہے جو محبت میں بھی۔ طیش میں بھی اور عیش میں بھی قانونِ عدل پہ قائم رہے۔ لہٰذا آج محبت کے بارے میں آپ سے گفتگو کروں گا۔

بزرگانِ من!

اگر تم اپنے جذبات پر قابو رکھو تو معلوم ہو گا کہ جذبۂ محبت قانونِ عدل سے ہٹاتا ہے۔ دیکھو نا!

مجھے آپ سے محبت ہے۔ اب بتاؤ کہ کیا ایسا نہیں ہو سکتا تو یہ قانونِ عدل کے خلاف ہے۔ بھلا ایسی بات پر توجہ دی جا سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔

یاد رکھو! جہاں محبت آ جائے وہاں لفظ "اپنا" خود بخود آ جاتا ہے جس طرح اپنا گھر، اپنا دیس، اپنا علاقہ، اپنا ملک، اپنا مذہب، اپنا خاندان، اپنا قبیلہ، اپنا باپ، اپنا بیٹا یا اپنا بھائی وغیرہ وغیرہ۔ گویا جہاں لفظ "اپنا" آ جاتا ہے وہاں محبت ہوتی ہے اور جہاں محبت ہوتی ہے وہاں قانونِ عدل سے انحراف ہوتا گیا۔

بچو!

تمہیں ایک بات سناؤں کہ ہمارے پنجاب میں ضلع جھنگ کے ایک

دیہات میں دو آدمی بیٹھے ہوئے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک کہہ رہا تھا کہ "میرے دادا جو تھے اللہ انہیں مغفرت کرے وہ بڑے ہی "چھٹے" ہوئے تھے مرحوم چوری کیا کرتے تھے مگر بڑے ہی شریف تھے۔ چنانچہ ایک دن وہ حضرت چوری کرنے گئے مگر وہ گھر والے سب بے ایمان تھے۔ جاگ رہے تھے۔

سامعین!

آپ نے سن دیا مگر میری زندگی کا محور یہی بات ہے کہ دادا اپنا تھا۔ اور باوجود چور ہونے کے خدا اس کی مغفرت کرے مگر وہ گھر والے جو جاگ رہے تھے وہ بے ایمان بن گئے۔ یوں ہوتا ہے۔ اپنے پرائے کا فرق۔ اگر گھر والے جاگ رہے ہیں کہ ہمارے گھر چوری نہ ہو تو وہ بے ایمان بن گئے اور چور چونکہ اپنا ہے اسے خدا اس کی مغفرت کرے۔ پھر تو یوں قانونِ عدل سے دنیا ہٹ جاتی ہے۔ محبت قانونِ عدل سے ہٹا دیتی ہے اور اجنبیت قانونِ عدل سے دور رکھتی ہے اب اگر آپ کو کسی سے محبت ہے تو اس میں کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔

دیکھو نا! ایک دفعہ کسی مولوی صاحب نے مجنوں سے کہا۔

"مجنوں میاں! خلافت کا جھگڑا ہے کچھ بتا دیں!"

مجنوں نے جواب دیا۔

"میری لیلیٰ ہی کو بنا دو۔ کیونکہ مجھے تو لیلیٰ سے بہتر کوئی دکھائی دیتا ہی نہیں ..."

پھر تو یہ جس کو جس سے محبت ہو جائے۔ وہ محبت قانونِ عدل پر قائم نہیں رہنے دیتی۔ اسی لیے تو کہتا ہوں کہ ہم فقیروں سے شکوہ نہ کیا کرو کہ فلاں کو فلاں سے محبت کیوں ہو گئی ہے یہ تو اپنے ذوق و شوق کی بات ہے کہ کسی کو شہنشاہ سے محبت ہو گی اور کسی کو ایک گڈریئے سے محبت ہو گی۔ کسی کو قید

کرنے والوں سے محبت ہوگی اور کسی کو قید ہونے والوں سے محبت ہوگی۔ الغرض
دیوانہ محبت وعشق ہمارے کسی ضابطے کا پابند نہیں ہے۔

سامعین یاد رکھو!

اگر انسان کے لئے سب سے پیاری شے کوئی ہے تو اس کی اپنی ذات ہے
گویا ہر انسان یہی چاہتا ہے کہ میں سب سے بڑا ہو کر رہوں۔ میری بات بلند ہے
میری عزت سب سے زیادہ ہو۔ میرا گھر سب سے اچھا ہو۔ میرا لباس سب سے
اچھا ہو۔ بہر نوع ہر انسان کو اپنی ذات سے سب سے زیادہ محبت ہوتی ہے اور
اپنی ذات سے بھی زیادہ اگر کوئی شے ایسی ہے جس سے انسان زیادہ محبت
چاہتا ہے تو وہ "بیٹا" ہے گویا ایک انسان کی سب سے زیادہ محبت والی
شے اگر کوئی ہے تو وہ اس کی "اولاد" ہے۔ خود پھٹا پرانا کپڑا پہن لیا مگر
بیٹے کو نیا خرید کے دیا۔ خود رات جاگ کے گذار دی۔ مگر بیٹے کو آرام سے
سلایا۔ گویا ہر باپ یہ نہیں چاہتا کہ مجھ سے کوئی بڑھ جائے مگر بیٹے کے لئے یہی
چاہتا ہے کہ مجھ سے بڑھ جائے خود میٹرک ہے مگر چاہتا یہی ہے کہ بیٹا بی اے
ہو جائے۔ خود بی۔ اے ہے تو چاہتا یہی ہے کہ بیٹا پی۔ ایچ ڈی ہو جائے
اور خود لندن سے ہو کر آیا ہے تو بیٹے کے بارے میں یہی چاہے گا کہ وہ جرمنی
چلا جائے۔ بہر نوع ہر باپ اپنے سے زیادہ اپنے بیٹے کو دیکھنا چاہتا ہے
ادھر اللہ بھی جب کسی کا امتحان لینا چاہتا ہے کہ آیا یہ قانون عدل پہ قائم بھی ہے
یا نہیں تو بیٹے سے امتحان لیتا ہے تاکہ دیکھ سکے کہ یہ انسان قانون عدل پہ قائم ہے
کہ نہیں یا قانون عدل سے ہٹ تو نہیں گیا۔

لہذا اس کی سب سے بڑی مشہور ومعروف مثال حضرت ابراہیم
کی مثال ہے۔ اللہ نے کہا

۸

ابراھیمؑ!

تم میرے خلیل ہو، میرے دوست ہو اور تمہارا بیٹا بھی ماشاءاللہ میرا خلیل ہے۔ لہٰذا، میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ کہیں تم بیٹے کی محبت میں قانونِ عدل سے ہٹ تو نہیں گئے؟

ابراھیمؑ نے جواب دیا۔

خداوندا! ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ ہم تیرے قانونِ عدل سے منحرف ہو جائیں۔

اللہ نے کہا۔

ابراھیم! ہم تو جب جانیں گے جب تم ہماری محبت کا مظاہرہ اپنے بیٹے کی محبت سے کرو گے تاکہ ہمیں پتہ چل سکے کہ تم واقعی قانونِ عدل پہ قائم ہو۔

ابراھیمؑ نے پوچھا۔

خداوندا! وہ کیسے؟

اللہ نے فرمایا۔

ابراھیم! اپنے بیٹے کو ہماری خاطر ذبح کر دو۔

سامعین!

بتاؤ۔ قانونِ عدل پہ قائم رہنے کے لئے اپنے بیٹے کو ذبح کرنا ایک بہت بڑی امتحان ہے کہ نہیں؟

دیکھو نا! ابراھیمؑ نے تو خواب میں دیکھا تھا کہ بیٹے کو ذبح کر رہا ہوں اور جانتے ہیں کہ نبی کا خواب یقیناً وحی ہوتا ہے۔ لہٰذا کیوں نا اسمٰعیل کی بے خبری میں کر دیا جائے۔ مگر ابراھیمؑ جانتا تھا کہ اگر میں نے یہ کام اسمٰعیل کی بے خبری میں کر دیا تو اس کا

اجر اسمٰعیل کو نہیں ملے گا۔ لہٰذا اسمٰعیل کو جگایا

"بیٹا اسمٰعیل! اٹھو"

چنانچہ جوان بیٹا اٹھ کے بیٹھ گیا اور عرض کی۔

"بابا! کیا حکم ہے؟"

ابراہیمؑ نے فرمایا "بیٹا! خداوند قدوس جل جلالہ کی طرف سے حکم ہوا ہے کہ ہم تمہیں ذبح کر دیں۔ بیٹا! تمہاری کیا رائے ہے؟"

ادھر "قائم بالقسط" کے مصداق نے بغیر سوچے سمجھے جواب دے دیا

"بابا جان پھر دیر کس بات کی ہے! حکم خدا کی جلد تعمیل کرو۔ انشاءاللہ آپ مجھے صابر پائیں گے۔ انشاءاللہ ہم باپ بیٹا دونوں قانون عدل پہ قائم رہیں گے"

بہر نوع دونوں میں مشورہ ہو گیا اور ساتھ یہ صلاح ہوئی کہ اسمٰعیل کی ماں کو اس کا پتہ نہ چلے۔ کیونکہ جوان بیٹے کی ماں ہے کہیں گھبرا نہ جائے۔ لہٰذا ابراہیمؑ نے اسمٰعیل کی ماں کو یہ کہا کہ اسے دوست سے ملنے لے جا رہا ہوں۔ چنانچہ ہاجرہ نے بیٹے کو نہلا دھلا کے کپڑے پہنائے اور دروازے تک چھوڑنے آئیں اور جب ابراہیمؑ بیٹے کو لے کر چل پڑے تو ایک بزرگ ہاجرہ کے پاس تشریف لائے اور کہا۔

"ہاجرہ! کچھ پتہ بھی ہے۔ باہر آؤ اور اپنے بیٹے کو پکڑ کر واپس لاؤ کیونکہ ابراہیمؑ اسے ذبح کرنا چاہتے ہیں"

ہاجرہ نے کہا"

"تم پاگل تو نہیں ہو! بھلا باپ بھی بیٹے کو ذبح کرتا ہے"

بزرگ نے کہا۔ "ہاجرہ! وہ کہتا ہے کہ مجھے وحی نازل ہوئی ہے"

ہاجرہ نے کہا۔

"ماشاء اللہ۔ اگر وحی ہوئی ہے تو بیشک ذبح کر ڈالے"۔

اب وہ بزرگ بولا "ہاجرہ! میں تمہیں سمجھا رہا ہوں۔ دیکھنا! یونہی عمر میں ذبیحی رہو، باہر نکلو اور بیٹے کو پکڑ کر واپس لاؤ کوئی وحی وغیرہ نہیں آئی کیونکہ ابراہیم بڈھا ہو چکا ہے اس لئے دماغ کام نہیں کرتا ہے"۔

ہاجرہ یہ سنکر غصے میں کہتی ہے۔ "لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہ"

یہ سنکر وہ بزرگ بھاگ کھڑے ہوئے اور بھاگتے ہوئے مڑ کر پوچھا۔

"ہاجرہ! تو نے مجھے کیسے پہچان لیا کہ میں لَا حَوْلَ وَلَا ہوں"۔

ہاجرہ نے جواب دیا۔

"نامراد۔ تو نے خود ہی تو سمجھا دیا۔ کیونکہ تو نبی کی بیوی کو گھر سے باہر نکلنے اور اسمٰعیل کو واپس لانے کی ترغیب جو دے رہا ہے اور جو نبی کی بیوی کو گھر سے باہر نکلنے کی ترغیب دے وہ شیطان ہی تو ہے"۔

پھر حضرت ابراہیم اپنے بیٹے کو لیکر اس جگہ پہنچے جہاں اسے ذبح کرنا مقصود تھا۔ ابراہیم نے وہاں پہنچتے ہی زمین کو صاف کیا۔ چھری تیز کی۔ پھر اس نے بیٹے کو لٹا دیا۔ اور پوچھا۔

"بیٹا! بھوک تو نہیں لگ رہی۔ کوئی پیاس تو نہیں لگ رہی کوئی کنکر تو نہیں چبھ رہی؟"

اسمٰعیل نے جواب دیا۔

"بابا جان! نہیں"۔

"بیٹا! اب میں حکم خدا کی تعمیل کروں؟"

"ہاں بسم اللہ"

ابراہیم نے پوچھا۔ بیٹا! کوئی فرمائش ہے!

اسمٰعیل نے جواب دیا۔

"ہاں بابا جان! آپ میرے ہاتھ پاؤں مضبوطی سے باندھ دیں تاکہ میں زیادہ تڑپنے نہ پاؤں۔ اور اپنے کپڑے بھی سمیٹ لیں تاکہ میرے خون کی کوئی چھینٹ آپ کے دامن پر نہ پڑ جائے جسے میری اماں نہ دیکھ لے۔"

چنانچہ یہ سب کچھ کرنے کے بعد ابراہیم نے اسمٰعیل کو لٹا دیا۔ ہاتھ میں چھری پکڑی اور جب ذبح کرنے لگے۔ یہ چھری گلے پر رکھی تو انہوں نے اپنی اور اسمٰعیل کی آنکھوں پر رومال ڈال دیا تاکہ بیٹا بھی چھری نہ دیکھ سکے اور ابراہیم بھی چھری نہ دیکھ سکے اس کے بعد ابراہیم نے "اللہ اکبر" کہہ کر اسمٰعیل کے گلے پر چھری چلا دی۔ اور کچھ دیر بعد ابراہیم نے جب اپنی آنکھوں سے پٹی ہٹائی تو دیکھا کہ بیٹا صحیح و سالم کھڑا مسکرا رہا ہے اور دنبہ ذبح ہو چکا ہے۔ ابراہیم نے آسمان کی طرف منہ کر کے بلند آواز میں کہا۔

"خداوندا! کیا تو مجھ سے ناراض ہو گیا؟ کیا میں قانونِ عمل سے ہٹ گیا؟ کیا تو نے میرے پٹی باندھنے کو محسوس کر لیا؟"

قدرت کی طرف سے جواب آیا۔

"ابراہیم! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم نے کب کہا تھا کہ ذبح ہو جائے گا؟ ہم نے تو یہ کہا تھا کہ ذبح کر ڈالو۔ لہٰذا تم نے اپنی بات پوری کر دی۔ بس تمہارا آزمائشی امتحان تھا۔ انشاء اللہ ہم یہ قربانی تم پر قرض رکھتے ہیں۔ کوئی سپوت بیٹا پیدا ہو گا جو تمہارے قرضے کو ادا کر دے گا!"

بزرگو! یاد رکھو۔ بیٹے کے معاملے میں امتحان دینا اور قانونِ عمل پہ پورا اترنا

بنی نوع آدم پر قرض ہے اور کائنات دیکھ رہی ہے کہ کون ایسا سعادت بیٹا آئے گا جو اس قرض کو ادا کرے گا۔

بس بھائیو!

اس قرضے کو ادا کرنے کے لیئے اپنے عزیزوں و جانثاروں کے ساتھ حسینؑ ابن علیؑ نے کربلا میں تشریف فرمائی اور کائنات منتظر ہے کہ ابراہیمؑ کا یہ سعادت بیٹا دادا کے قرضے کو کس شان سے ادا کرے گا۔

حضور والا!

کربلا کا بھیانک بن ہے اور لاکھوں خونخواروں کے درمیان بہترؑ کا قافلہ ہے سر تیغ میں بہتر کا سردار کھڑا ہے اور ہر سمت سے کان میں آواز آ رہی ہے۔

• مولا! میں گر گیا "۔ میرے آقا! میں گر گیا۔

• میرے وارث! مجھے اٹھاؤ۔

جب مولا اور آقا کی آوازیں آنی بند ہو گئیں اور ساقی عرب اور وارثِ ابوطالبؑ رہ گئے تو حسینؑ نے کس کا انتظار کئے بغیر حکم دیا۔

• علی اکبرؑ! بیٹا۔ میں حکم دیتا ہوں کہ تم میدانِ شہادت میں جاؤ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمیں کے نیچے دب کر رہ جائیں۔ بھائیؑ کا بیٹا قتل ہو جائے اور دنیا یہ کہے کہ اپنے بیٹے کو روک لیا تھا۔

پھر کیا تھا ادھر امامؑ کا حکم ہوا ادھر علی اکبرؑ میدان کی طرف چل پڑا۔ ابھی چند قدم چلا ہی تھا کہ حسینؑ نے آواز دی۔

• علی اکبرؑ! بیٹا۔ ذرا ٹھہرو۔

اکبرؑ ٹھہر گئے۔ پھر فرمایا۔

• بیٹا! گھوڑے سے اترو۔ چنانچہ علی اکبرؑ گھوڑے سے نیچے اتر آئے

اور عرض کی۔

"بابا جان! کیا حکم ہے؟"

امام نے فرمایا۔

"بیٹا! بیت الشرف میں جاؤ اور ماں کو سلام کرو۔ پھوپھی کو سلام کرو
بہنوں سے رخصت ہو۔"

چنانچہ علی اکبرؑ خیمے میں تشریف لائے اور حسینؑ بھی ساتھ ساتھ چلے آئے
خیمہ میں آکر حسینؑ نے زینبؑ سے کہا۔

"زینبؑ! اکبرؑ آرہا ہے آج میں سننا چاہتا ہوں کہ پھوپھی
بھتیجے میں کیا بات ہوتی ہے۔"

چنانچہ علی اکبرؑ خیمے میں تشریف لائے اور لیلیٰ کو سلام کیا۔

"اماں! سلام"

ماں جواب میں کہتی ہے۔

"اکبر بیٹا! تم ابھی تک زندہ ہو۔ میرے لعل! میں صبح سے
مصلے بچھائے بیٹھی ہوں۔ تاکہ تیری میت آئے تو شکرانے کی نماز
پڑھوں۔"

علی اکبرؑ نے کہا۔

"اماں! میں جا رہا ہوں:"

"بیٹا! خدا حافظ۔"

علی اکبرؑ ماں سے رخصت ہو کر پھوپھی کے پاس آئے اور آتے ہی زینبؑ
کی گود میں سر رکھ دیا۔ اور لیٹ گئے اور عرض کی۔

"پھوپھی اماں! دیکھو۔ میں تمہارا اکبرؑ ہوں۔ مجھے پیار کر دو۔"

تو

ادھر حسینؑ کھڑے ہوئے دیکھ رہے ہیں کہ آج پھوپھی بھتیجے میں کیا باتیں ہونگی تھوڑی دیر بعد اکبرؑ نے عرض کی

• اماں! آپ ہی اس بات کی گواہ ہیں کہ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے۔ جو بات بھی پوچھی ہے آپ ہی سے پوچھی ہے اور جو کچھ بھی مانگا ہے آپ ہی سے مانگا ہے۔ گویا سوائے آپ سے میں نے کسی سے واسطہ ہی نہیں رکھا۔ اماں جان! آج بھی آپ سے ایک مسئلہ پوچھتا ہوں۔"

زینبؑ نے کہا۔

• بیٹا! آج کون مسئلہ پوچھنے کا موقع ہے۔

• علی اکبرؑ نے عرض کی۔ اماں جان! آج ایک مسئلہ بتا دو۔

• اچھا میرے لعل! پوچھو۔ کیا پوچھتے ہو۔"

علی اکبرؑ نے عرض کی۔

• اماں جان! میری دادی فاطمہؑ کا مرتبہ زیادہ ہے یا آپ کا؟

زینبؑ ایک دم گھبرا کے فرماتی ہیں۔

• بیٹا! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ کہاں فاطمہؑ کی شان۔ کہاں میں میں تو فاطمہؑ کی ادنیٰ کنیز ہوں۔

اب جو زینبؑ نے کہا کہ میں تو فاطمہؑ کی ادنیٰ کنیز ہوں تو علی اکبرؑ یہ تو سنتے ہی پیاں پڑ کے بیٹھ گئے اور فرمایا۔

• اماں جان۔ اگر تم واقعی فاطمہؑ کی کنیز ہو تو پھر ایک کام کرو۔ کہ آج فاطمہؑ کے بیٹے پر اپنے بیٹے کو قربان تو کر دو۔

ہائے بھائیو!

علی اکبرؑ کا یہ کہنا تھا کہ ادھر سے حسینؑ نے آواز دی۔

"زینبؑ! میں تاکتا تھا کہ آج میں سُننا چاہتا ہوں کہ پھوپھی بھتیجے میں کیا بات ہوتی ہے۔"

بہر نوع دونوں بہن بھائیؑ نے مل کر اکبرؑ کو آخری لباس پہنایا۔ زینبؑ نے عبا پہنائی اور حسینؑ نے عمامہ باندھا۔ مگر اس طرح باندھا گویا کفن باندھ دیا۔ اکبرؑ روانہ ہوئے کبھی کسی بہن نے آکے عبا کا دامن پکڑ لیا۔ کبھی کسی بی بی نے روک لیا۔ کبھی پھوپھی نے ٹھہرا لیا۔ جب بڑی دیر ہو گئی تو امامؑ نے فرمایا۔

"بیبیو! مسافر کا رستہ نہ روکو۔"

چنانچہ امامؑ کے کہنے سے سب خاموش ہو گئے۔ علی اکبرؑ جب سب سے رُخصت ہو کر خیمے سے باہر نکلے اور ابھی دروازہ کے قریب ہی تھے کہ ایک درد بھری آواز آئی۔ جس کو حسینؑ جیسا صابر انسان سُن کر آنکھوں پہ ہاتھ رکھ کے بیٹھ گیا اکبرؑ ابھی دروازہ کے قریب ہی تھے کہ پیچھے سے آواز آئی۔

"اکبرؑ! ہم سے بھی ملتے جاؤ۔"

علی اکبرؑ پلٹ کے دیکھتے کیا ہیں کہ بیمار بھائی چلا آرہا ہے۔ دونوں بھائیوں نے گلے میں ہاتھ ڈال دیئے اور حسینؑ جیسا صابر آنسو پونچھتا ہوا باہر نکل آیا۔ اللہ جانے بھائیوں میں کیا راز و نیاز کی گفتگو ہوئی بہر نوع اکبرؑ خیمے سے باہر آئے اور حسینؑ نے رکاب پکڑ کے سوار کر دیا اور فرمایا۔

"بیٹا! جاؤ۔ خدا حافظ۔"

اکبرؑ میدان کو چلے حسینؑ بھی پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ تھوڑی دور جا کر اکبرؑ نے باگ روک لی۔ اور عرض کی۔

"بابا! جا ملتے! میں اکیلا آؤں گا!"

حسینؑ نے فرمایا۔ نہیں بیٹا۔ جاؤ۔

"بابا جان! پھر آپ تکلیف کیوں کر رہے ہیں؟"

حسینؑ نے فرمایا۔

"بیٹا اکبرؑ! تمہارا اگر کوئی جوان بیٹا نہیں۔ تمہیں اندازہ ہی نہیں کہ ہمارے دل پہ کیا گذر رہی ہے۔

اچھا بیٹا! ہم بیٹھ گئے۔ تم جاؤ"

عزادار سید الشہداؑ!

یہ کہہ کر حسینؑ ایک ٹیلے پہ بیٹھ گئے اور علی اکبرؑ میدان میں آ گئے۔ ادھر جنگ شروع ہو گیا۔ علی اکبرؑ کی نظر فوجوں پہ۔ حسینؑ کی نظر علی اکبرؑ پہ۔ دروازہ میں کھڑی ہوئی زینبؑ کی نظر حسینؑ پہ اور صحن پہ بیٹھی ہوئی لیلیٰ کی نظر زینبؑ پہ لگی ہوئی ہے۔ گویا یہاں سے وہاں تک نظر کا تار بندھ گیا۔

بس بھائیو! کوئی دس منٹ ہی گذرے ہوں گے کہ اکبرؑ گھوڑے سے حسینؑ ٹیلے سے گرے۔ زینبؑ دروازے میں گری اور لیلیٰ سجدے میں گری

"یا اللہ! تیرا شکر ہے کہ میری نیک کمائی نیک راہ میں کام آئی"

بزرگو!

علی اکبرؑ نے گھوڑے سے گرتے ہی آواز دی "یا ابتاہ ادرکنی"

"بابا جان! میں گر گیا"

حسینؑ چلے اور جب اکبرؑ کی لاش تو دس قدم رہ گئی تو فرمایا۔

"اکبرؑ بیٹا! ایک دفعہ پھر پکارو۔ بیٹا! ہمیں راستہ نظر نہیں آ رہا ہماری بینائی کام نہیں کر رہی۔ لہٰذا تم ہمیں آواز دو تاکہ ہم تمہاری آواز کے سہارے آ جائیں"

چنانچہ علی اکبرؑ نے پھر آواز دی "ما انت الیّ الیّ۔ بابا جا

میں یہاں ہوں۔

حسینؑ آواز کے سہارے میت پر پہنچے۔ دیکھا کہ

اکبرؑ ایک پاؤں سمیٹتا ہے اور ایک پاؤں پھیلاتا ہے۔ حسینؑ میت کے پاس بیٹھ گئے۔ گود میں اکبرؑ کا سر لے لیا اور فرمایا۔

"بیٹا علی اکبرؑ! ہم آ گئے"۔

اکبرؑ نے عرض کی۔ "بابا جان! آپ نے بڑی تکلیف فرمائی ہے"۔

حسینؑ نے فرمایا۔

"بیٹا! کہو۔ کہو کیا چاہتے ہو!"

اکبرؑ نے عرض کی: "بابا جان! آج اکبرؑ آپ سے دو چیزیں مانگتا ہے۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ اگر ہو سکے تو۔ دو گھونٹ پانی دے دو"۔ گویا جوان بیٹے کا زندگی میں باپ سے پہلا سوال ہی یہی تھا کہ "دو گھونٹ پانی دے دو"۔

حسینؑ نے فرمایا "اکبرؑ بیٹا! گھبراؤ نہیں تمہارے دادا ابھی تمہیں سیراب کریں گے"۔

اکبرؑ نے فرمایا۔

"بابا جان! دوسری فرمائش کرتا ہوں کہ ابھی میں زندہ ہوں لہٰذا مجھے گھر لے چلو تاکہ میں پھوپھی اور اماں سے آخری بار مل سکوں"۔

حسینؑ نے کہا۔

"ہاں بیٹا! تمہاری یہ فرمائش ہم ضرور پوری کریں گے"۔

یہ کہہ کر حسینؑ نے ایک ہاتھ اکبرؑ کی گردن کے نیچے رکھا اور ایک ہاتھ پیروں کے نیچے رکھا اور "یا علیؑ مدد" کہہ کے میت اٹھانا چاہی۔ جوان میت بھاری تھا

آسکی۔ ہاتھ تھرائے۔ زمین پر رکھ دی۔ تھوڑی دیر بعد پھر ارادہ کیا۔ اب سے
سینے تک اٹھائی۔ مگر ہاتھ پھر بھی تھرائے میت زمین پر لٹا دی۔ اور حسینؑ نے

فرمایا۔

"اکبر بیٹا! ایک کام کرو کہ دو سے ہم اٹھاتے ہیں اور پھر تم دونوں
ہاتھ ہمارے گلے میں ڈال دو۔ پھر تم سہارا کرو۔ پھر ہم سہارا کریں گے"

چنانچہ اکبرؑ نے ایک ہاتھ باپ کے گلے میں ڈال دیا۔ حسینؑ نے کہا۔

"بیٹا! دوسرا ہاتھ بھی ڈال دو۔"

اکبرؑ نے عرض کی: "بابا جان! دوسرا ہاتھ میں سینے سے اٹھانا نہیں چاہتا"

"کیوں بیٹا! کیا بات ہے"

"بابا بات یہ ہے! میں اپنا سینہ آپ کو دکھانا نہیں چاہتا"

حسینؑ نے فرمایا۔

"بیٹا! کوئی بات نہیں۔ ہمیں بھی دکھاؤ۔ ہم دیکھیں گے"

اب جو اکبرؑ نے سینے سے ہاتھ اٹھایا تو حسینؑ نے دیکھا کہ برچھی کا پھل ٹوٹ
کے اکبرؑ کے سینے میں رہ گیا ہے اور اکبرؑ کا دل اس میں پھنسا ہوا ہے۔ حسینؑ نے دیکھ
کے فرمایا۔

"بیٹا! یہ بات تھی۔ گھبراؤ نہیں"

یہ کہہ کے حسینؑ نے بیٹے کی میت کو زمین پر لٹایا۔ خود دو زانو بیٹھے۔ ایک
ہاتھ بیٹے کے سینے پر رکھا۔ ایک ہاتھ میں برچھی پکڑی اور کھینچنے کا ارادہ کیا۔

بلند آواز سے آسمان کی طرف منہ کر کے کہا۔

"نانا رسول اللہ! دادا ابراہیمؑ کو بلا کے یہیں آؤ اور دیکھو! میری
آنکھوں پر رومال نہیں ہے۔ میری آنکھوں پر پٹی نہیں ہے۔ میرا

ہاتھ نہیں لرز رہا۔ میرا بدن نہیں کانپ رہا۔

خداوندا!

دیکھ۔ آج میں دادا ابراہیمؑ کا قرض چکا رہا ہوں:

بزرگان محترم!

حسینؑ نے برچھی کو ہلایا۔ برچھی ہلی تو اکبرؑ کا بندھا بھی دل ہلا۔ دل ہلا تو سارا بدن تھرایا۔ بدن کا تھرانا تھا کہ کربلا میں زلزلہ آیا۔ کربلا میں زلزلہ آیا تو حسینؑ کے خیموں میں زلزلہ آیا اور خیموں پہ زلزلہ آنا تھا کہ پردہ اٹھا اور زینبؑ نے آواز دی۔

حسینؑ بھیا! مجھے آنے دو۔ اکیلے یہ کام نہ کرنا۔ دو نوں بہن بھائی مل کے یہ کام کریں گے:

زینبؑ کا یہ کہنا تھا کہ حسینؑ نے وہیں سے آواز دی۔

زینبؑ! باہر نہ آنا۔ تیرے پردے پہ اکبرؑ کو قربان کرتا ہوں۔

عزادارِ سید الشہداء!

آج سے چند سال قبل کربلا معلیٰ میں حرم سید الشہداء میں ضریح اقدس کے پاس کھڑے ہو کر۔ نماز صبح کے بعد شیخ مہدی نامی ایک شخص تھوڑی دیر مصائب سید الشہداء پڑھا کرتے تھے۔ یہی گویا صبح کا ایک وظیفہ تھا ایک روز انہوں نے علی اکبرؑ کی شہادت چھیڑ دی۔ بڑا گریہ ہوا۔ واپس گھر گئے۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد جب سو گئے۔ تو خواب میں دیکھا کہ سیاہ برقعہ والی ایک خاتون آئی ہیں اور آئی ہیں۔

شیخ مہدی! شیخ کہتا ہے کہ میں خواب میں ہی اُٹھ کے بیٹھ گیا اور عرض کی۔

بی بی! کیا بات ہے؟

بی بی نے فرمایا۔

شیخ! مجھے پہچانو۔ میں حسینؑ کی ماں ہوں۔

شیخ کہتا ہے کہ میں تھر تھر کانپنے لگا۔ اور عرض کی

حضور! کیا حکم ہے؟

بی بی نے فرمایا۔

شیخ! تم نے آج حرم میں علی اکبرؑ کی شہادت پڑھی ہے آئندہ یہ شہادت نہ پڑھنا۔

شیخ نے عرض کی۔

کیوں بی بی! کوئی غلط روایت پڑھ دی تھی؟

بی بی نے فرمایا۔

نہیں۔ بالکل درست کہا تھا۔ مگر جب سے تو نے یہ واقعہ پڑھا ہے کہ اکبرؑ جوان کے لاشے پر ہاتھ رکھ کر حسینؑ نے کہا۔

و غربتا۔ یا اللہ! میں غریب ہو گیا۔ اس وقت سے میرا حسینؑ بے ہوش پڑا ہے۔ وہ اب بھی اکبرؑ کو یاد کر رہا ہے۔ میں اب تک اُسے بہلا رہی ہوں۔

سامعین!

تاویل عدل یہی ہے جس پہ حسینؑ نے اکبرؑ جیسے بیٹے کی محبت کو قربان کر دیا۔ اللہ یہی ہے وہ ذبح عظیم جو میدان کربلا میں ادا کیا گیا

اللہ ہمیں مودت محمدؐ و آل محمدؐ عطا فرمائے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ۔ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّآلِ مُحَمَّدٍ

قانونِ عمل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خداوند عزّاسمہٗ وجلّ جلالہٗ کی حمد و ثنا کے بعد حضرات محمد و آلِ محمد پر درود و سلام

حضراتِ گرامی قدر!

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اللہ چاہتا ہے کہ انسان اپنے ہر قول و فعل و عمل سے قانونِ عدل پر قائم رہے۔ عدل سے تجاوز نہ کرے بلکہ ہر معاملہ میں قانونِ عدل پہ قائم رہے۔ یہی اللہ کا منشاء ہے اور یہی وہ انسان سے چاہتا ہے۔ اب اللہ کے چاہنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اگر انسان عدل پہ قائم رہے گا تو اللہ کو کوئی فائدہ پہنچے گا اور اگر عدل کو چھوڑ دے گا تو اللہ کو کوئی نقصان ہو گا۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اللہ ہر نوع اللہ ہے۔ اللہ کا کسی حالت میں کچھ نہیں بگڑتا۔ اگر ساری دُنیا مل کے اللہ کا نام لے تو سبحان اللہ اور اگر ساری دُنیا اس کا نام لینا چھوڑ دے تو ماشاء اللہ۔ اللہ کا کچھ نہیں بگڑتا۔ وہ تو صاف کہتا ہے کہ۔

اگر تم مجھے یاد رکھتے ہو تو شاباش اور اگر بھول جاتے ہو تو جاؤ جہنم میں؛

لہٰذا اللہ جو کچھ بھی چاہتا ہے اس کی جو کچھ بھی منشاء ہے وہ اس لئے ہے کہ ہمارے اندر یہ خوبی ہو۔ ہمارے اندر یہ کمال ہو اور صرف اس لئے کہ دُنیا میں عدلِ حقیقی قائم رہے۔ لہٰذا اللہ نے عدلِ حقیقی کے ایک لاکھ چوبیس ہزار نمونے انسان کو دکھائے اور سمجھائے۔ یہاں تک کہ جب سب سامنے نمونے دکھا چکا تو عدل کو ہمارے دل میں راسخ کرنے کے لئے اس نے عدلِ حقیقی کو۔ قائم کر دیا تاکہ کسی طرح انسان عدل پہ قائم ہو جائے۔

صاحبانِ ذوق!

اللہ نے پہلا نمونۂ عدل جو ہمیں دکھایا وہ تھے ہم سب کے بابا آدم۔ اور جب آدم بن کے تیار ہوگئے تو اللہ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ "اسکی طرف رُخ کرکے سجدہ کرو"۔ یہ نہیں کہا کہ "اس کو سجدہ کرو"۔ بلکہ یہ فرمایا کہ سجدہ اللہ کو کرو۔ مگر آدم کو "قبلہ" بنا کے کرو۔ اِدھر فرشتے بیچارے سجدے بجالانے سے بڑی سادہ سی مخلوق۔ سوائے حکم کی تعمیل کے کچھ جانتے نہیں تھے۔ انہیں جب حکم ملا کہ "سجدہ کرو" تو فوراً حکم کی تعمیل میں انھوں نے اپنے سر جھکا دیئے

پھر اعلیٰ حضرت کی طرف سے حکم ہوا۔ "ابھی ٹھہرو"

چنانچہ فرشتے ٹھہر گئے اور عرض کی

"قبلہ! آپ ہی نے تو حکم دیا ہے۔ اب روکتے کیوں ہو"

اعلیٰ حضرت نے فرمایا۔

"فرشتو! بیشک اس کی طرف سجدہ کرو کیونکہ یہ ہمارا بنایا ہوا ہے مگر ذرا ٹھہرو۔ کیونکہ جب اس میں "رُوح" آجائے گی تو پھر سے سجدہ کرنا"

چنانچہ فرشتوں نے آدم کو جب سجدہ کیا جب اس میں رُوح آگئی۔

سامعین!

یاد رکھو۔ تخلیقِ آدم کے ساتھ اللہ نے ہمیں یہ قانونِ عدل سکھا دیا کہ میں "قبلہ" ضرور بناتا ہوں مگر اس وقت تک وہ قبلہ نہیں بن سکتا جب تک اس میں میری رُوح نہ آجائے۔ چاہے وہ خلیل بنائے یا خود اپنے ہاتھوں سے خلیل بنائے۔ وہ قبلہ جب بنے گا جب اس میں میری رُوح آجائے گی!

حضور والا! یہی نکتہ تھا کہ آج سے پانچ ہزار سال قبل اللہ کے

ایک خلیل بندے نے مکّے میں اللہ کا ایک گھر بنایا۔ ذہن میں تصور یہ تھا کہ اللہ جانے یہ گھر کیسا ہوگا۔ کیونکہ میں نے تو گورنمنٹ ہاؤس دیکھا تھا۔ اس وقت میں نے اندازہ لگایا تھا کہ جب گورنر اور نوابوں کی حویلیاں کئی میلوں تک پھیلی ہوئی ہیں تو اللہ جانے۔ خدا معاذ حق۔ کتنا بڑا ہوگا۔ دنیا کے سب سے بڑے شہنشاہ کا محل اللہ جانے کتنا وسیع ہوگا۔ اور اللہ کا گھر بناتے وقت بھی یہی تصور غالباً حضرت ابراہیمؑ کا بھی ہوگا کہ۔

۔ خداوندا! تیرا گھر بنانا ہے۔ ذرا اس گھر کا نقشہ تو بھیج دے تاکہ تیرا گھر بناؤں۔ اللہ نے جواب دیا۔

۔ ابراہیمؑ: سنتے بھی ہو۔ گھر تو میرا ہی ہوگا۔ مگر زیادہ تاپ توڑ کی ضرورت نہیں ہے۔ بس اتنا کرو بنا دو کہ بوقت ضرورت ایک عورت آرام سے لیٹ سکے کیونکہ میں نے نہ خود آ کے رہنا ہے اور نہ ہی کرائے پہ دینا ہے۔ بلکہ یونہی خالی پڑا رہے گا چاہے اس پہ بت قبضہ کر لیں۔ چاہے بت پرست قبضہ کر لیں مگر گھر میرا ہے۔ میں ہی اس گھر کا مالک ہوں۔

ہم پوچھتے ہیں۔

۔ خداوندا: تو قادر مطلق ہو کر، اتنی بڑی طاقت والا ہو کر اپنے گھر پر کیوں ان نامراد بتوں کا قبضہ ہونے دیا۔ اللہ جواب میں فرماتا ہے۔

۔ دیکھو منا: تم ابھی نادان ہو۔ کسی بات کو اچھی طرح سمجھتے نہیں ہو۔ اگر بت میرے برابر کے ہوتے تو میں ان سے لڑتا اور جن بتوں کو دوسروں نے بنا کے مجھ برابر ان سے لڑنا میری توہین ہے۔ اگر ان پہ میں نے فتح بھی پالی تو بات کیا ہوئی۔ لہٰذا اگر یہ نامراد بت بیٹھے ہی تو بیٹھے رہو۔ جب وقت آئے گا خود ہی نکل جائیں گے۔

سامعین!

ادھر بحث ہی کر ضد کر بیٹھے کہ ہم نہیں نکلتے کیونکہ خدا کا گھر ہے اور
ہم لوگوں کے بنائے ہوئے خدا ہیں!
لہٰذا مجبوراً اللہ کو ایسا آدمی بھیجنا پڑا کہ جس نے آتے ہی تبروں سے یہی کہا: نکل جاؤ میرے گھر سے۔ تمہیں معلوم نہیں کہ یہ میرا زچہ خانہ ہے؟
بہر طور ابراہیمؑ نے اللہ کا گھر بنایا جس کو اب مسلمان قبلہ سمجھ کر سجدہ کرتے ہیں۔ اور گھر بنانے کی شان یہ تھی کہ ابراہیمؑ معمار اور اسمٰعیلؑ مزدور بن گئے۔ جبرئیلؑ اینٹے ساون بن گئے اور اعلیٰ حضرت خود انجینئر بن گئے اور اپنی موجودگی میں دیکھ دیکھ کے بنوا رہے تھے۔ ادھر ابراہیمؑ دیوار کا ایک ردا لگاتے اور ہر ردے پہ ہونے والی دعا مانگ لیا کرتے

خداوندا! تیرا گھر بن گیا۔ اب مجھے یہ مل جائے۔ اب میری اولاد کو یہ مل جائے۔ اور وہ دے دیا۔ اور گھر تیار ہوا۔ اور جب پورا گھر بن گیا تو اللہ نے اس گھر کا نام "بیت اللہ" رکھ دیا

میرے بھائیو! یہاں تک تو میں نے کہہ دیا کہ اس گھر کا نام اللہ نے "بیت اللہ" رکھ دیا۔ اب آپ خود ہی بتائیں کہ اگر کوئی اس گھر میں رہنے لگ جائے تو وہ کیا کہلائے گا؟ = **اہلبیت**۔ گویا سب اہلبیت بن گئے؟ ہرگز نہیں۔ کیونکہ گھر میں رہنا اور بات ہے اور اہلبیت ہونا اور بات ہے بہر طور بیت اللہ بن گیا اور ابراہیمؑ نے عرض کی۔

"خداوندا۔ تیرا گھر بن گیا۔ اب معائنہ کر کے دیکھ لے۔"

چنانچہ اعلیٰ حضرت نے معائنہ کیا اور فرمایا۔

"ابراہیمؑ! شاباش۔ بہت اچھا گھر بنا ہے مگر تم دونوں باپ بیٹا

مل کر ایک کام کرو:

"میرے گھر کو طواف کرنے والوں کے لئے پاک کرو۔"

سامعین!

اللہ نے صرف ابراہیم اکیلے کو حکم نہیں دیا بلکہ فرمایا کہ تم دونوں مل کے میرے گھر کو طواف کرنے والوں کے لئے پاک کرو۔

چنانچہ دونوں باپ بیٹے نے مل کے گھر کو پاک کرنا شروع کیا اور پاک کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ کعبہ کی دیواروں میں لگی ہوئی اینٹوں میں سے ایک ایک اینٹ پہ ہاتھ رکھا اور کہا۔ **سُبحانَ اللہ** ، دوسری پہ ہاتھ رکھا اور کہا۔ **سُبحانَ اللہ** تیسری پہ ہاتھ رکھا اور کہا۔ **سُبحانَ اللہ** ، جب ساری اینٹوں پہ ہاتھ رکھ کے سُبحان اللہ کہہ دیا تو اللہ نے کہا۔ "**پاک ہوگیا**"۔ گویا ابراہیم نے حکم خدا کعبے کی تمام اینٹوں پہ سبحان اللہ کہہ کے تمام دیوار کعبہ کو تسبیح کے دانے بنا دیا۔ اب جب دیوار کعبہ تسبیح کے دانے بن گئی تو وہ امام، کہ خود ہی ساتھ مل جائے گا۔ بہر طرح خدا کا گھر پاک ہوگیا اور پاک کیا بھی ابراہیم و اسمٰعیل دونوں نے مل کر

سامعین!

یاد رکھو! اللہ کہتا ہے کہ میرا قانون عدل ہی یہی ہے کہ میں جب بھی کوئی کام لیتا ہوں تو ایک سے نہیں لیتا بلکہ دو سے لیتا ہوں کیونکہ دو کے بغیر میرا کام چل سکتا ہی نہیں۔ دو ہوں تو کام کرو ورنہ بیٹھے رہو۔"

دیکھو نا! دور جانے کی ضرورت نہیں قریب سے ہی دیکھو کہ ابراہیم کے ساتھ ہم نے اسمٰعیل کو لگا دیا۔ محمد کے ساتھ ہارون کو لگا دیا۔ اسی طرح ہر ایک کے ساتھ دوسرا لگاتے رہے اور جب بیٹے اکیلے رہ گئے کوئی دوسرا معصوم نہیں تھا۔ تو اللہ نے کہا۔

"عیسٰیؑ! تم اکیلے ہو اور اکیلے سے ہم کوئی کام نہیں لیا کرتے لہٰذا تم غائب ہو جاؤ"۔ چنانچہ عیسٰیؑ غائب ہو گئے

پھر نورِ ہدایت کا یہ سلسلہ چلتے چلتے جب محمدؐ تک پہنچا تو اللہ نے محمدؐ کے ساتھ علیؑ کو لگایا۔ علیؑ کے ساتھ حسینؑ کو لگا دیا۔ یہاں تک کہ گیارہویں کے ساتھ بارہویں کو لگا دیا اور جب بارہواں اکیلا رہ گیا تو خدا نے اپنے قانونِ عدل کے مطابق اُسے بھی غائب کر دیا۔ اُدھر عیسٰیؑ اکیلا رہ گیا اُسے غائب کر دیا گیا۔ اِدھر بارہواں اکیلا رہ گیا اسے بھی غائب کر دیا گیا۔ جب تک دونوں اکیلے رہیں گے غائب رہیں گے اور جب اللہ اُن سے ہدایت کا کام لینا چاہے گا تو پھر انہیں ملا دے گا۔
اب یہ دونوں کہاں ایک دوسرے سے ملیں گے۔ یہ بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے۔ کیونکہ ایک غائب ہے زمین پر اور ایک غائب ہے آسمان پر۔ لہٰذا دونوں کے غائب ہونے میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اِدھر عیسائی بچہ گروہ اَڑ کے کہتا ہے

"مسلمانو! تمہارے والا زمین پر غائب ہے اور ہمارے والا آسمان پر غائب ہے۔"

بھائیو!

اب ان عیسائیوں کو کون سمجھائے کہ خدا نے دونوں کو غائب کرتے وقت قانونِ عدل کی میزان میں تولا تھا ایک۔ کم وزن تھا کہ آسمان پہنچ گیا اور ایک اتنا وزن والا تھا کہ زمین پر رہ گیا۔ اور رہ گیا ان دونوں کے ملنے کا طریقہ کہ یہ کہاں ملیں گے تو یہ بات وقت بتائے گا کہ آسمان والا آئے گا یا زمین والا جائے گا۔ پھر دونوں ملیں گے تو ہدایت کا کام شروع ہو گا۔

حضورِ والا!

قیامت کے دن جب مسلمان اور عیسائی آپس میں جھگڑیں گے کہ امام کون ہے؟

تو اتفاق سے ایک پٹواری صاحب اگر آجائیں تو یہ مسئلہ بہت جلد حل ہو جائے گا۔ کیونکہ وہ آکر یہی کہے گا۔

مولوی صاحبان: تم کیوں خواہ مخواہ کے لئے جھگڑ رہے ہو۔ یہ مسئلہ تو ہمارے سمجھانے کا ہے کہ چونکہ بیٹے زمین چھوڑ کر بے دخل ہو گئے تھے اور یہ آج تک اپنی زمین پر قابض ہے۔ اور قابض و دخیل کار کے ہوتے ہوئے بے دخل کو زمین پر امامت کروانے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

بہر نوع زمین والا ہی نماز پڑھائے گا اور ہم نماز پڑھیں گے تو دیکھیں گے کہ نصیری اور نصاریٰ میں لڑائی ہو رہی ہو گی۔ کیونکہ نصاریٰ کے خدا کا بیٹا پیچھے ہو گا اور نصیری کے خدا کا بیٹا آگے ہو گا۔ اس دن نصیری کہے گا کہ ہم نہ کہتے تھے کہ ... ہمارے خدا کا بیٹا آگیا ہے۔

بہر کیف خدا کے قانون عدل کے مطابق دو ہوں گے تو کام ہو گا۔ اسی طرح خدا نے ابراہیم اور اسمٰعیل دونوں سے کعبہ کو پاک کروانے کا کام کروایا اور جب کعبہ میں بتوں سے گھر بنا لیا۔ اور سے پاک کروایا تو اس وقت بھی تنہا محمدؐ نہیں تھے بلکہ علیؑ بھی ساتھ ہی تھے۔ دونوں نے مل کے خدا کے گھر کو پاک کیا۔

چنانچہ اعلیٰ حضرت نے فرمایا۔

محمدؐ! اسے قبلہ بناؤ۔

خداوندا۔ کیسے؟

اعلیٰ حضرت نے فرمایا کہ جب اس میں میری روح آجائے گی تو یہ قبلہ بن جائے گا۔

ادھر دنیا انتظار میں تھی کہ اعلیٰ حضرت کی روح کب آئے گی۔ کہاں سے آئے گی اور کس طرح قبلہ بنے گا۔ یہاں تک کہ خدا کے آخری رسولؐ بھی آ گئے

ان سے پوچھا گیا کہ حضورؐ! قصیدہ بنا؟

۔ حضورؐ نے فرمایا ... نہیں

۔ حضورؐ! کب بنے گا؟ ۔

حضورؐ نے فرمایا۔ گھبراؤ نہیں ... ابھی بن جائے گا ۔ یہاں تک کہ ایک دن رسولؐ نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے ۔

۔ خداوندا ۔ تو نے مجھے آخری رسولؐ بنایا ہے ۔ تو نے مجھے کائنات کا ہادی بنایا ہے ۔ لہذا میں تجھ سے فریاد کرتا ہوں کہ مجھے ... مددگار ، بھی اپنے ہی گھر سے دے ۔

اللہ نے کہا ۔ محمدؐ! میں اسی دعا کا منتظر تھا ۔ تو نے میرے گھر سے مددگار مانگا لہذا ضرور ملے گا ۔

حضورِ والا!

ادھر رسولؐ نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور ادھر اسد کی بیٹی اور اسد کی ماں الہامی طور پر خدا کے گھر کے قریب پہنچی گھر کا طواف کیا ۔ ایک جگہ ٹھہری اور ابھی ٹھہری ہی تھی کہ کعبہ کی دیوار شق ہو گئی ۔

نوجوانو! اگر تم کہیں چلے جا رہے ہو اور تمہارے سامنے خالی دیوار اچانک شق ہو جائے تو تم گھبرا نہیں جاؤ گے ۔ مگر اسد کی بیٹی کا جگر دیکھو کہ ادھر دیوار شق ہوئی اور ادھر وہ بھاگی نہیں بلکہ فرماتی ہیں ۔

۔ بھاگیں ہمارے دشمن ۔ ڈریں ہمارے دشمن ۔ میں ایک تاڑنے والے کی ماں ہوں۔

لہذا جب دیوار شق ہوئی تو یہ خاتون بجائے بھاگنے کے آگے بڑھی اور کعبہ میں آ کر بیٹھ گئیں اور دیوار پھر بند ہو گئی ۔ اب گھر میں فاطمہ بنت اسد اکیلی

بیٹھی ہیں۔ ادھر رسولؐ کو وحی پہنچی کہ۔

"محمدؐ! سنتے ہی ہو۔ جسے تم نے میرے گھر سے مانگا تھا وہ آ گیا ہے لہٰذا اسے جا کے لاؤ۔" چنانچہ رسولؐ تشریف لائے۔ چچی کو سلام کیا

"امّاں! سلام"

فاطمہ بنت اسد نے کہا۔ محمد بیٹا! وعلیکم سلام۔

"امّاں! میرے بھائی کو میری گود میں دو۔"

چنانچہ رسولؐ قریب گئے۔ آخر وصی کی رسالت مجلی اور اول وصی کی امامت تھی۔ نور کا ایک ٹکڑا دوسرے نور سے متصل ہوا۔ بھائی بھائی کے سینے سے لپٹ گیا۔ تھوڑی تھوڑی لبوں پہ مسکراہٹ آئی۔

ہم پوچھتے ہیں۔ قبلہ! ہنستے کیوں ہو؟

وہ فرماتے ہیں۔

"ہنسنے کی تو بات ہے۔ یہ صاحب عالم ازل سے مجھے چھوڑ کر آ گئے تھے۔ آج ہم بچپن کے ساتھی ایک دوسرے سے پھر ملے ہیں لہٰذا ہنستا ہوں کہ ہم آ گئے نا۔"

بچے کو محمدؐ نے سینے سے لگایا۔ بوسہ لیا اور فرمایا۔

"امّاں! مبارک ہو۔ ماشاءاللہ بڑا خوبصورت ہے۔"

ماں نے کہا۔

"محمدؐ! خاک مبارک ہو۔ اس میں زندہ رہنے کی کوئی آثار ہیں ہی نہیں دیکھو نا! تین دن ہو گئے اسے کعبہ میں آئے ہوئے۔ نہ اس نے آنکھ کھولی۔ نہ اس نے دودھ پیا اور نہ ہی یہ رویا۔ ایسے بچے کا زندہ رہنا مشکل ہے۔"

محمدؐ نے کہا۔ "امّاں! گھبراؤ نہیں۔" یہ کہہ کر حضورؐ نے بچے کو ہاتھوں

پر لٹایا۔ اور پوچھا۔

"برخوردار! ہم نے تمہاری تمام شکایتیں سُن لی ہیں۔ بتاؤ۔ تم نے آنکھ کیوں نہیں کھولی؟" بچے نے عرض کی۔

"قبلہ! اگر آنکھ کھولتا تو کعبہ میں رکھے ہوئے بتوں سے نظر مل جاتی اور جب نظر مل جاتی تو ٹوٹتے ہوئے ضرورت نا آجاتی۔ اب حضورؐ آگئے ہیں۔ لیجئے۔ آنکھ کھول دی؟"

یہ کہہ کر بچے نے آنکھ کھولی اور پہلی نظر چہرہ رسولؐ پر پڑی

بچو! آپ جانتے۔ یا علی اس دنیا میں آکر کریں۔ سچ بات تو یہ ہے کہ آپ کے علی نے سب تھا کہ مجھ سے پہلے کوئی نہیں مگر جب میں جب محمدؐ کو دیکھا تو آنکھ کھل گئی۔

پھر فرمایا بچے نے آنکھ کھول دی۔ اب محمدؐ پوچھتے ہیں۔

"برخوردار! تم روئے نہیں؟"

فرمایا "نہیں"

"کیوں؟"

"قبلہ! بات یہ ہے کہ میرا دل تو رونے کو بہت چاہا مگر میں رونے کو ضبط کرتا رہا۔ کیونکہ کعبہ میں میری ماں اکیلی تھی اور میں اس کا ساتھی تھا۔ اس لئے ساتھی ہوتے ہوئے روتا مجھے پسند نہ آیا۔"

اب محمدؐ مسکراتے ہوئے پوچھتے ہیں۔

"برخوردار! تم نے دودھ کیوں نہیں پیا؟"

فرمایا "حضور! بھوک لگ رہی تھی مگر معاف کرنا اگر اور بچوں کی طرح پیدا ہوتا تو ضرور اپنی ماں کا دودھ پیتا۔ مگر آپ نے رسالت کا دعویٰ کیا ہے آپ کو

گواہ کی ضرورت ہے لہٰذا آپؐ نے اللہ سے دُعا کی کہ اپنے گھر سے گواہ دے۔ چنانچہ میں آپ کے طلب کرنے پر بطور گواہ آیا ہوں اور جب آپ کے طلب کرنے پر بطور گواہ آیا ہوں تو اپنی ماں کا دودھ کیوں پیوں کیوں کہ گواہ کا خرچ خوراک خدا کے ذمہ ہوتا ہے اس لئے آپ خود میری خوراک کا انتظام فرمائیں۔

بچّے کی یہ باتیں سُن کر رسُولؐ نے اپنی انگشت مبارک دہن میں داخل کی۔ دُودھ جاری ہوا۔ ایک دو گھونٹ پی کر بچّے نے منہ پھیر لیا۔ رسُولؐ سمجھ گئے کہ گواہ ذرا تر مال چاہتا ہے۔ رسُولؐ نے اب جو زبان اقدس دہن میں داخل کی تو زبان سے دُودھ جاری ہوا۔ اور خوب پیٹ بھر کے پیا۔ اور جب پی چکے تو ننھے ہونٹوں سے زبانِ رسُولؐ مضبوط پکڑ لی۔ ادھر رسُولؐ اشارے سے فرماتے ہیں۔ چھوڑو بھی اُدھر بچّہ اشارے میں جواب دیتا ہے۔ چھوڑو بھی۔

چنانچہ رسُولؐ اسی طرح اپنی زبان بچّے کے دہن میں ڈالے ہوئے گھر تک آئے۔ گھر کے جتنے بڑے تھے وہ ہکّا بکّا کھڑے ہو گئے۔ ادھر بچّے نے جو دیکھا کہ رسُولؐ کی زبان دہن میں ہے تو مُسکرایا اور آنکھوں میں خاندان کے بزرگوں سے کہہ رہا تھا۔

۔ خاندان کے بزرگو! گواہ رہنا۔ پیدا ہوتے ہی مجھے زبان دے چکے ہیں؛

رسُولؐ نے بچّے کو گہوارے میں لٹا دیا۔ اوپر ایک چادر اوڑھا دی۔ مُبارکباد دینے والے لوگ آنے لگے اور پوچھنے لگے۔

۔ محمّد! ماشاء اللہ۔ شکل کیسی ہے؟۔

رسُولؐ فرماتے ہیں۔

۔ کیا بتاؤں اس کی شکل کیسی ہے کیونکہ بچّے اماموں کی شکل ہوتے ہیں جیسے

گھر پیدا ہوں۔ اور یہ بچہ ایسے گھر میں پیدا ہوا ہے جس کی کوئی شکل ہی
نہیں لہٰذا میں نہیں کون سی شکل بتاؤں۔
ادھر سے اعلیٰ حضرت نے کہا۔
محمد۔ واہ بڑی مشکل ہے تو ہمارے گھر میں ایک بچہ پیدا ہوا
اور تم اس کی شکل بتاتے ہوئے گھبراتے ہو۔ کہہ دو کہ اس بچے کی آنکھیں
عین اللہ ہیں۔ چہرہ۔ وَجْهُ اللّٰه ہے۔ ہاتھ۔ یَدُ اللّٰه
ہیں اور زبان۔ لسان اللہ ہے۔
چنانچہ رسولؐ نے بھی کہہ دیا آنکھیں عین اللہ ہیں۔ چہرہ وجہ اللہ ہے ہاتھ
ید اللہ ہیں۔ اور زبان لسان اللہ ہے۔ جب رسولؐ سب کچھ کہہ چکا تو خیال آیا
یہ کیا ہو گیا کیونکہ اللہ سے دعائیں مانگ مانگ کے میں نے تو اپنا مددگار مانگا
تھا مگر اللہ نے ایک ایک کرکے پھر واپس لے لیا اب میرے پاس کیا رہ گیا؟
لہٰذا تب تک جو اللہ نے نہیں کہا تھا وہ رسولؐ نے جلدی جلدی کہہ دیا۔
یا علی لحمک لحمی۔ دمک دمی۔
یا علیؑ! تیرا میرا گوشت ایک۔ تیرا میرا خون ایک۔
سامعین!
ہاتھ اور آنکھیں وغیرہ اللہ نے دے دیں اور گوشت خون رسولؐ نے دے دیا۔
اور ادھر ہم گہوارے کی طرف دیکھتے ہیں تو بچہ ہنستے جا رہا ہے۔ ہم نے عرض کی
یا علیؑ۔ ہنستے کیوں ہو!
بچہ جواب میں کہتا ہے۔ آج لطف آ گیا۔
قبلہ! کیا لطف آ گیا!۔
دیکھو نا! آج ہم تقسیم ہو گئے۔ آج ہم بٹ گئے۔ آدھے اللہ کے

حصے میں آ گئے اور آدھے رسُول کے حصّے میں آ گئے۔ ہمارے پاس تو کچھ رہا ہی نہیں۔ اب اگر کوئی مجھ سے بیعت کرے گا تو آدھی اللہ سے کرے گا اور آدھی رسُول سے کرے گا۔ اور اگر کوئی مجھ سے عبادت کرے گا تو آدھی اللہ سے کرے گا اور آدھی رسُول سے کرے گا:

بچّو!

تمہیں ایک واقعہ سُناؤں کہ جب ہمارے رسُول اس بچے کو لیکر گھر پہنچے ہیں تو تھوڑی دیر بعد حضرت ابُوجہل تشریف لائے۔ ان کا ذریعہ معاش ہی یہ تھا کہ جس گھر میں جو بچہ پیدا ہوتا وہ اس کی آنکھوں میں کسی بڑے بُت کے پاؤں کی مٹی بطور سرمہ لگاتے اور سُنا روپیہ ہدیہ لیکر گھر جاتے چنانچہ وہ آج بھی تشریف لائے کہ بڑے گھر میں بچہ پیدا ہوا ہے بہت انعام ملے گا۔ ابُوجہل نے آتے ہی محمّد سے کہا۔

محمّد! مبارک ہو۔ خدا نے بھائی عطا کیا ہے اگر اجازت ہو تو میں اپنا کام کر دوں۔

رسُول حسن روک کر فرماتے ہیں۔۔ بچے سے پوچھ لو۔

ابُوجہل آگے بڑھا ایک ہاتھ میں سلائی پکڑی۔ ایک ہاتھ سے بچے کی آنکھ کھولی اور ابھی سلائی آنکھ کے قریب ہی تھی کہ بچے نے وہ دو ہاتھ رسید کر دیا۔ گویا ابُو اِدھر رہ گیا اور جہل اُدھر رہ گیا۔ اور وہ یہ کہتا ہوا وہاں سے بھاگ پڑا۔ یہ خاندان بڑا جادوگر ہے:

بزرگو!

اب معترض یہ کہتا ہے کہ

ذیدی صاحب! شرم کرو۔ منبر پہ بیٹھ کر جھوٹ بولتے ہو۔

بھلا تین دن کے بچے میں اتنی طاقت آ سکتی ہے کہ وہ طمانچہ مارے؟

میں کہتا ہوں۔ بھائیو!

اس شخص کے برابر کا تو کوئی بُرا ہے ہی نہیں جو منبر پہ بیٹھ کے جھوٹ بولتا ہو۔ دیکھو نا! یہ تو سیدھی سادھی بات ہے کہ اگر تین گھنٹے کا بچہ "جیسے" بات کر سکتا ہے تو تین دن کا بچہ طمانچہ بھی مار سکتا ہے اس میں جھگڑے کی کیا بات ہے۔

اب معترض کہتا ہے۔

زیدی صاحب! بات کرنا اور چیز ہے اور طمانچہ مارنا اور چیز ہے!

میں کہتا ہوں۔ مولوی صاحبان نے!

جھگڑے میں نہ پڑو۔ دیکھو! بقول تمہارے عیسیٰؑ "کنت اللہ فی البلد" اس نے بات کرلی۔ اور یہ بچہ "بے دست" تھا لیکن اس نے طمانچہ مار دیا۔ اور اگر اب بھی سمجھ نہ آئے تو ہمارے پنجاب کا یہ محاورہ بھی سن لو کہ "کمزور کی بات" چلے۔ اور "طاقتور کا ہاتھ" چلے ___

حضور والا!

آج کعبہ کی قسمت ہی پلٹ گئی آج کعبہ کی شان ہی بدل گئی۔ آج کعبہ اندر ہی اندر گیا۔ ادھر بچہ رسولؐ کے سینے پہ پلتا رہا۔ زبان رسولؐ چوس کے پرورش پاتا رہا اور جتنا اس نے پینا تھا پی لیا اور جو علیؑ سے باقی بچا وہ علیؑ کے بچوں نے اب کا باں سمجھ کے پینا شروع کر دیا۔ بہرکیف علیؑ رسولؐ کے سینے پہ پلتا رہا۔

یہاں تک کہ جوں جوں اس بچے کا سن بڑھتا رہا توں توں رسولؐ کا دن بڑھتا رہا۔ رسولؐ کی طاقت بڑھتی رہی۔ رسولؐ کی شان بڑھتی رہی اور جب دس برس کا ہو گیا تو مثال

کا جذبہ تو اللہ کو بھی جوش آگیا۔

محمد! سمجھتے بھی ہو۔ بس اب انتظار کی گھڑیاں ختم ہوگئیں۔ پہلے اب اعلان کر دو۔ کام شروع کر دیں کیونکہ تیرے مددگار کو انشاءاللہ اب کافی طاقت آگئی ہے۔ مگر عوام سے بات نہ کرنا بلکہ پہلے اپنے گھر والوں سے بات کرو۔

چنانچہ رسول نے گھر والے بلا لیے۔ تقریباً چالیس بنی ہاشم کا مجمع لگا کے بیٹھ گئے۔ ان میں حضرت ابولہب بھی ہیں۔ حضرت عتبہ ہیں۔ حضرت عقیبہ ہیں۔ حضرت شعبہ ہیں۔ تو اقرب تو ہیں نا۔ یہ اور بات ہے کہ ... ع ... سے مقرب ہیں مگر ہیں تو قریب۔ یہ رشتہ سب حضرات تشریف فرما ہیں اور ایک کونے میں حضرت ابی طالب بھی تشریف فرما ہیں [illegible] مولا کا رحم ہوا کھڑا ہے۔ یہ کیفیت جب سب اکٹھے ہو گئے تو رسول تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہوئے ہیں۔ لسان اللہ کی پہلی تقریر ہے۔ جو ابھی نہیں ہوا اس کا بھی خط ہے عالمین کے رسول کی پہلی تقریر ہے۔

سامعین!

آپ کو معلوم ہے کہ کسی عالم کی پہلی تقریر اس کی پوری علامت کی پالیسی ہوتی ہے لہذا آج رسول کی پہلی تقریر اس کی ساری زندگی کا خلاصہ ہوگا۔ ادھر رسول تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہوئے۔ ادھر ساری کائنات رسول کی تقریر سننے کیلئے متوجہ ہوگئی۔ درخت کا ایک ایک پتہ سننے کے لیے کان بن گیا۔ ستارے گوش بر آواز سننے کے لیے بے سہارا ہو گئے۔ زمین پہ بھی جو نازک بیلیں تھیں سننے کے لیے درختوں پہ چڑھ گئیں۔ زمین و آسمان کی فضا سننے کے لیے ٹھہر گئی اور چلتی ہوئی ہوائیں سننے کے لیے رک گئیں۔ اور رسول نے تقریر شروع کر دی۔

لوگو! میں تمہارے لیے دنیا و آخرت کی خوبی لیکر آیا ہوں۔

اگر میری بات مان لوگے تو دنیا کی خوبی بھی تمہیں ملے گی اور آخرت کی خوبی بھی تمہیں ملے گی گویا قیصر و کسریٰ کے تاج تمہارے قدموں کے نیچے ہوں گے۔

لوگو! تم میں سے کون ہے جو میری مدد کرے؟

رسول کی یہ بات سُن کر تمام لوگوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اشارے کئے خاموش ہو گئے۔ دوسری دفعہ رسول نے پھر فرمایا۔ کون ہے جو میری مدد کرے؟ مگر جب کہیں سے جواب نہ آیا۔ تو دنیا نے دیکھا کہ ایک دم زمین و آسمان میں زلزلہ پیدا ہوا۔ کائنات لرز گئی اور چشم فلک نے ستاروں کی عینک لگا کے اس منظر کو دیکھا۔ جبرئیل نے سدرہ سے سر پہ تاج چڑھا کے دیکھا۔ حوروں نے جنت کے دریچے کھول دیئے۔ کوثر کے منہ میں پانی بھر آیا سبیل نے سبیل نکال کے تماشہ کیا کہ گیارہ سال کا بچہ کونے سے اٹھا اور عرض کی

"حضور، پھر فرمائیں کیا حکم ہے؟"

رسول نے فرمایا۔

"بیٹا! ہم یہ کہہ رہے تھے کہ کون ہے جو ہماری مدد کرے۔"

یہ سُن کر بچے نے نظریں اٹھائیں اور کہا۔ انا ناصرک یا رسول اللہ

"یا رسول اللہ میں تیرا ناصر و مددگار ہوں۔"

سامعین!

"یا محمد" نہیں کہا بلکہ "یا رسول اللہ" کہا۔ اگر "یا محمد" کہتے تو محمد کی زندگی تک ساتھ ہوتا مگر "یا رسول اللہ" کے معنی یہ ہیں کہ جب تک تیری "رسالت" ہے جب تک میری "نصرت" تیرے ساتھ ہے۔

بچے کی یہ ادا دیکھ کے رسول مسکرائے اور فرمایا۔ بیٹا! سوچ لو۔

بچے نے عرض کی۔

حضور! سن لیا۔

بیٹا! غور کر لو۔

حضور! کر لیا۔

بیٹا! یہ بچوں کا کھیل نہیں ہے۔

حضور! میں جان پہ کھیل کے کہہ رہا ہوں۔

بیٹا! یہ بڑا مشکل مرحلہ ہے۔

حضور! گھبرائیے نہیں۔ میں بھی مشکل کشا ہوں۔ فکر نہ کرو تمہارے دشمنوں کی آنکھیں نکال دوں گا۔ تمہارے دشمنوں کے پیٹ پھاڑ دوں گا۔ تم بے شک جو کہنا چاہو کہو۔ اور جو کرنا چاہو کرو۔ کیا مجال کسی کی جو تمہارے پروگرام میں رکاوٹ ڈالے جب تک تیری رسالت ہے میں ساتھ دوں گا۔

بزرگانِ من!

علیؑ کہہ رہے تھے اور ابی طالبؑ کے فرزند الحمد للہ کی تسبیح پڑھ رہے تھے۔ اور یاد رکھو! علیؑ نے رسولؐ سے اتنا بڑا وعدہ کیا ہے کہ اس سے زیادہ بڑا وعدہ کوئی ہو سکتا ہی نہیں تھا۔

دیکھو نا! دیوار کی طرف حکومت بیٹھ رہی تھی مگر رسولؐ کا ساتھ دینے کا وعدہ کرنے والا رسولؐ کی بیعت لئے بیٹھا۔ گویا اس سے بہتر ساتھ کسی نے دیا ہی نہیں۔

توجہ ہے نا صاحبان!

علیؑ نے رسولؐ سے کہہ دیا میں ساتھ دوں گا۔ اور میرے بچے انشاءاللہ آپ کا ساتھ دیں گے۔ میری پوری نسل آپ کا ساتھ دے گی۔ آپ گھبرائیے نہیں آپ فکر نہ کریں انشاءاللہ قیامت تک میری اولاد آپ کے ساتھ رہے گی۔ اور محمدؐ یاد رکھو! میں اسطرح ساتھ

دوں گا کہ دین پھیلے گا اس کا۔ کلمہ پڑھا جائے گا محمدؐ کا اور گلہ کٹ جائے گا علیؑ کا؟

میرے عزیز بچو!

اگر گلہ کٹ جانے تک ہی بات ختم ہو جاتی تو غنیمت تھا۔ مگر گلہ کٹ جانے تک بات ختم نہیں ہوئی بلکہ یوں کہیے کہ علیؑ نے رسولؐ سے یہ کہا کہ۔ قبلہ! دین اللہ کا پھیلے گا۔ کلمہ تیرا پڑھا جائے گا اور میری بیٹیاں میری قید ہو جائیں گی۔ کیونکہ نوجوانوں کا کٹ مرنا اور بات ہے اور بہو بیٹیوں کا قید ہونا اور بات ہے۔ اور محمدؐ دیکھ! میری بیٹیاں ہی نہیں بلکہ میری بہوئیں جو غیر خاندان سے آئی ہیں وہ بھی تیرے دین کی خاطر میری بیٹیوں سے بڑھ کر قربانی دیں گی۔ میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں:

نوجوانو! مجھے معاف کرنا میری کہانی ہی کچھ ایسی ہے۔ میں مجبور ہوں ورنہ میرا بھی نہیں چاہتا کہ تم رو پڑو۔

دیکھو نا! زینبؑ کی قربانی ہو تو وہ علیؑ کی بیٹی ہے لہٰذا اس کی شان اور ہے کلثومؑ کی قربانی کا انداز اور ہے مگر جو علیؑ کے گھر میں غیر خاندان کی آئی تھیں۔ ذرا ان کی قربانی کی شان دیکھو۔

محترم سامعین!

مجھے آپ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچ کر بتائیں کہ اگر ایک خاتون بیوہ ہو جائے اور اس کی گود میں ایک بچہ ہو تو اس کے تمام جذبات کا مرکز وحید وہی بیٹا ہوتا ہے۔ وہ بیوہ اپنی ساری زندگی اس بچے کے سہارے گزار دیتی ہے کہ یہ جوان ہوگا۔ اس کی شادی کروں گی۔ اس کے سہرا باندھوں گی۔ اس کا گھر بسے گا اور میں دوبارہ آباد ہوں گی۔ گویا ایک بیوہ کی توجہ کا مرکز اس کا بیٹا ہوتا ہے۔

حضور والا!

۶۱ھ میں حسینؑ کی شہادت ہوئی۔ بوقت شہادت حسنؑ کی بیوہ اپنے شوہر کے سامنے

کھڑی ہے۔ گود میں دو سال کا بچہ ہے اور اپنے شوہر سے کہہ رہی ہے۔

"میرے سرتاج! میرے لئے کیا حکم ہے؟

حضور حسن مجتبیٰ نے ارشاد فرمایا: قاسم کی ماں! تو اپنی ساری زندگی اس بچے کے ساتھ گذار دے۔ یہ بچہ قیامت تک تیرے نام کو قائم و باقی رکھے گا۔

بہرکیف امام حسن مجتبیٰ کی رحلت ہو گئی اور قاسم کی ماں قاسم کو گود میں اٹھا کر زینب کے پاس روزانہ آتی اور فرماتی۔

"بی بی! میں تو غیر خاندان کی ہوں۔ اُمتی ہوں۔ آپ سادات ہیں اور یہ بچہ آپ کا ہے۔ اب اتنے سال کا ہو گیا میں نے اس کے لئے یہ لباس تیار کیا ہے۔ بی بی! دیر نہ کرنا جب چودہ سال کا ہو جائے تو اس کی شادی کر دینا۔ بی بی! مجھے اپنی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ میں ایک دفعہ قاسم کے چہرہ پر سہرا دیکھنا چاہتی ہوں۔"

میرے بھائیو! قاسم کا تیرھواں سال ہوا تو حسین کے ساتھ کربلا میں آ گیا۔ اور قاسم کی ماں نے قاسم کی شادی کے سارے کپڑے اپنے ساتھ اٹھا لئے تاکہ ہو سکتا ہے راستے میں ضرورت پڑ جائے۔

محترم سامعین!

کربلا میں دن گذرتے گئے۔ حتیٰ کہ عاشورہ کی شب آ گئی اور امام خیمے سے واپس ہو کر جب مصلّے پر جا کے بیٹھے تو قاسم ماں کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی۔

"اماں جان! بڑی بی بی نے عون و محمد اپنے بچوں کے لئے کل کی اجازت مانگی ہے۔ لہٰذا میں بھی اپنے لئے اجازت مانگ رہا ہوں۔"

قاسم کی ماں نے کہا: "جاؤ بیٹا! جاؤ۔ حسین سے تم بھی اجازت مانگو۔" بہرکیف قاسم وہاں تشریف لائے جہاں امام مصلّے پر بیٹھے معبود حقیقی کے ساتھ راز و نیاز کر

باتیں کر رہے تھے۔ قاسمؑ نے آتے ہی سلام کیا۔ "چچا جان! السلام"

امامؑ نے سر اٹھاتے ہی دیکھا اور فرمایا۔

"قاسم بیٹا! تم رات کو کیوں گھر سے باہر آئے۔ جاؤ میرے لعل!

اپنی اماں کے پاس جا کر آرام کرو۔" امامؑ نے جو یہ کہا تو دل بھر آیا۔ چنانچہ قاسمؑ کو گود میں بٹھا کر بھائی حسنؑ کو یاد کیا۔

"قاسم بیٹا! تجھ سے بھائی حسنؑ کی خوشبو آ رہی ہے۔ ہائے بھائی حسنؑ!

آج حسینؑ اکیلا رہ گیا۔" تھوڑی دیر بعد حسینؑ نے آنسو پونچھتے ہوئے فرمایا۔

"قاسم بیٹا! جاؤ گھر میں جا کر آرام کرو۔"

قاسمؑ نے کہا۔ "مولا! ایک بات پوچھتا ہوں۔"

امامؑ نے فرمایا۔ "ہاں بیٹا! پوچھو۔ کیا بات ہے؟"

قاسمؑ نے عرض کی۔ "مولا! کل کے شہید ہونے والوں میں میرا نام ہے؟"

امامؑ نے سمجھا کہ بارہ سال کا بچہ ہے۔ اللہ جانے اس کے دل پر کیا اثر ہو۔ چنانچہ بھتیجے سے یہ فرمایا۔

"قاسم بیٹا! تم تو بڑے ہو۔ تمہارے چھوٹے بھائی اصغرؑ کا نام بھی ہے۔"

بس بھیا سنو! اب جو مولا نے اصغرؑ کا نام لیا تو قاسمؑ جو بیٹھا تھا کھڑا ہو گیا اور انگڑائی جو لی تو قبا کے بند ٹوٹ گئے اور بھرائی آواز میں فرمایا۔

"مولا! ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ کیا یہ بے حیا فوج اصغرؑ کے لیے تک پہنچ جائے گی؟"

قاسمؑ کی اس ادا پر امامؑ کو پیار آ گیا۔ گود میں اٹھایا، پیار کیا۔

"قاسم بیٹا! کس کی مجال ہے کہ تمہاری زندگی میں کوئی اصغرؑ تک آ جائے۔"

پھر بیٹا قاسمؑ اٹھے۔ ماں کے پاس آئے اور کہا۔

• قاسم ! پیارا یہ لباس اتار دو اور فقیروں والا لباس مجھے پہنا دو۔ میں ابھی جان کے اندھیرے میں ایسے ۔ تا قبر پہ جانا جاتا ہے ۔ ہاں شکست ہوں گا۔

• بی [illegible] نادان ! مجھے حسین نے مرنے کی اجازت نہیں دی۔

قاسم کی بیوہ ماں نے جو یہ سنا کہا۔

• بیٹا ! گھبراؤ نہیں۔ میں تمہیں اجازت دلواتی ہوں۔ چنانچہ ایک ہاتھ میں چادر لیا اور ایک ہاتھ میں قاسم کا بازو پکڑا اور حسین کی پشت کی طرف آکر کھڑی ہو گئی اور عرض کی: حسین ! اگر آج حسن زندہ ہوتے تو میں دامن ... تیری بیوہ بھاوج آج تجھ سے قاسم کی موت کی بھیک مانگنے آئی ہوں؟

امام نے جواب میں فرمایا۔

• بابی جان ! آپ نے کیوں تکلیف فرمائی۔ میں خود ہی حاضر ہو جاتا۔

کہو کیا بات ہے !

قاسم کی ماں نے عرض کی۔

حسین ! میں تیرے یتیم بھتیجے قاسم کو لائی ہوں اسے بتا دو کہ شہید ہونے والوں میں اس کا نام بھی ہے۔ حسین ! دیکھو میں سوالی نہیں ہوں۔ بیوہ خاتون کی ہوں کل کے مرنے والوں میں اگر قاسم نہ ہوا تو میرا دودھ بدنام ہو گا۔ لہٰذا مجھے بتا دو کہ یہ بھی شہید ہو گا؟

چنانچہ حسین نے قاسم کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ گویا اجازت مل گئی۔ ادھر قاسم کی ماں خوشی خوشی خیمے میں واپس آئی اور زینب سے کہا۔

• بی بی زینب ! مجھے مبارک دو۔ کل کے مرنے والوں میں قاسم کا نام بھی ہے۔

سامعین !

رات کا پچھلا پہر تھا اور حسن کی بیوہ نے اپنے ساتھ آئے ہوئے صندوق کھولے۔

قاسمؑ کی شادی کے جتنے جوڑے بنائے تھے ایک ایک کرکے پہنائے اور اسی عالم میں صبح ہوگئی۔ اور صبح کو جب میدان شہادت گرم ہوگیا اور جب قاسمؑ کی باری آئی تو حسینؑ اپنے چھوٹے بھائی عباسؑ غازی سے پوچھتے ہیں: "عباسؑ بھائی! ابھی چھوٹے یتیم بھتیجے کی باری نہیں آئی؟"

عباسؑ نے عرض کی۔ "مولا! قاسمؑ کے بدن پر کوئی زرہ پوری نہیں آتی۔"

جب یہ کہنا تھا کہ خیمے سے قاسمؑ کی ماں نے آواز دی۔

"عباسؑ بھائی! زرہ وہ پہنتے ہیں جو لوٹ کے آتے ہیں۔ چونکہ میں اسے مرنے بھیج رہی ہوں اس لئے اسے بغیر زرہ ہی کے بھیج دو۔"

اس کے بعد قاسمؑ کی ماں نے قاسمؑ کو جامۂ سبز کرتا پہنایا اور حسینؑ نے بھائی حسنؑ والا سرخ عمامہ باندھا اور امامؑ نے گود میں لیکر گھوڑے پر بٹھایا اور قاسمؑ میدان میں آگئے۔

عزادار سید الشہداءؑ!

میں اپنی گفتگو کو یہاں آکر ختم کرتا ہوں کہ تھوڑی دیر بعد میدان سے آواز آئی اب تک جتنے شہید ہوئے تھے چاہے اپنے تھے یا غیر سب نے گرتے وقت حسینؑ کو پکارا تھا مگر قاسمؑ اتنا کمسن تھا کہ اس نے گرتے وقت حسینؑ کو نہیں پکارا بلکہ ایک دم گھبرا کے آواز دی۔

"اماں جان! میں گر گیا۔"

گویا قاسمؑ کی معصومیت کی بات تھی کہ اس نے گرتے وقت ماں کو پکارا پھر قاسمؑ کی آواز پر حسینؑ چلے۔ میدان میں پہنچے۔ قاسمؑ کی میت دیکھی اور فرمایا۔

"قاسمؑ بیٹا! مجھے معاف کرنا۔ میں ذرا دیر سے پہنچا ہوں۔" یہ کہہ کر حسینؑ نے اپنی عبائے مبارک کندھے سے اتاری اور زمین پر بچھا دی اور میت کا ایک ایک

اٹھا اٹھا کر خیمہ میں رکھا۔ گویا بنی ہاشم کا نازک ترین شہزادہ اپنی زندگی ہی میں پامال ہو گیا۔ حسینؑ قاسمؑ کی لاش کے ٹکڑوں کی گٹھڑی اٹھا کے خیمے میں لے آئے۔ ادھر ماں نے یہ بھی کہ حسینؑ لاش نہیں لائے۔ فرمایا

"حسینؑ ! قاسمؑ کی لاش نہیں لائے۔ میں بیوہ ہوں۔ کیسے بھیجوں ؟"

حسینؑ نے فرمایا۔

بھابی ! آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ میں قاسمؑ کی لاش لایا ہوں۔ مگر شاید آپ دیکھ نہ سکیں گی۔

قاسمؑ کی ماں نے کہا۔

"حسینؑ ! مجھے دکھاؤ قاسمؑ کی لاش۔ آخر بات کیا ہے۔"

یہ سن کر امامؑ نے گٹھڑی قاسمؑ کی ماں کے سامنے رکھ دی۔ اب جو قاسمؑ کی ماں نے بیٹے کی لاش کے ٹکڑے دیکھے تو بلند آواز سے فرمایا۔

"زینبؑ ! ادھر آؤ۔

کلثومؑ ! ادھر آؤ۔

بی بیو ! ادھر آؤ۔

مجھے مبارک باد دو کہ میری قربانی سب سے زیادہ قبول ہوئی ہے۔ آج میرے بچے کی شادی ہوئی ہے۔"

ادھر حسینؑ نے اس خیال سے کہ کہیں ماں مر نہ جائے، قاسمؑ کی لاش کو اٹھایا اور میدان میں لے گئے اور اکبرؑ کے لاشے کے ساتھ رکھ دیا اور دونوں لاشوں کے بیچ میں بیٹھ کر ایک ہاتھ قاسمؑ کی لاش پہ اور ایک ہاتھ اکبرؑ کی لاش پہ رکھ کر آسمان کی طرف رُخ کر کے بلند آواز میں فرمایا۔

"وا غربتاہ ۔ یا اللہ ! میں غریب ہو گیا۔"

محسنِ اعظم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خداوند عزاسمہٗ وجل جلالہٗ کی حمد وثنا کے بعد حضرات محمدؐ وآل محمدؐ پر درود وسلام

حضرات گرامی قدر!

قرآن مجید کی ہر چھوٹی آیت میں زندگی کا کوئی نہ کوئی اہم اصول بیان کیا گیا ہے مثلاً ایک آیت ہے "ھل جزاء الاحسان الا الاحسان"۔ اللہ نے اس آیۂ کریمہ میں لفظ "احسان" کو دو بار ادا کیا ہے۔ اور اس آیت کا ترجمہ مختصر وقت میں یہی ادا ہو سکتا ہے کہ "احسان کا کوئی بھی بدلہ نہیں سوائے احسان کے"۔

اگر تمہارے ساتھ کسی نے حسن سلوک کیا ہے یا کوئی اچھی طرح پیش آیا ہے اگر کسی نے تمہارے ساتھ کوئی بھلائی کی ہے یا کوئی نیکی کی ہے تو اس کا بدلہ ضرور دو کیونکہ بھلائی کا بدلہ بھلائی ہے۔ شرافت کا بدلہ شرافت سے ہونا چاہئے۔ گویا یہ ایک اصول ہے جو اللہ نے اس آیۂ کریمہ میں بیان کر دیا ہے۔

بزرگان من!

اگر ہم اپنی ساری زندگی میں اس اصول کو پلے باندھ لیں اور اس پر عمل کرتے رہیں تو دنیا کے تقریباً نوے فیصدی جھگڑے ہی ختم ہو جائیں۔ تمام فسادات ہی تقریباً ختم ہو جائیں۔ یہ گویا ایک اصولی بات ہے۔ لہٰذا اس اصول کو ذہن میں رکھئے جو میں نے آج آپ سے عرض کرتا ہوں کہ۔

سامعین کرام! بتاؤ تمہارا سب سے بڑا محسن کون ہے جس کا تم پر سب سے زیادہ احسان ہے؟۔

حاضرینِ مجلس!

تم جتنا چاہو، سوچ لو، آخر اسی محور پر آجاؤ گے کہ ہمارا سب سے بڑا محسن اگر کوئی ہے جسکے تم احسان کا بدلہ ادا کر سکتے ہو تو وہ محسن یہ ہے جس نے تمہیں عدم سے وجود دیا اور ناپید سے پیدا کیا، بتاؤ وہ محسن اعظم ہے یا نہیں؟ یقیناً وہ محسن اعظم ہے جس نے تمہیں پیدا کیا ہے۔ دیکھو نا! ایک وقت وہ تھا کہ ہم نہیں تھے مگر آج ہم ہیں اور ایک وقت وہ ہوگا جب ہم نہیں ہوں گے۔ گویا ہمارے ادھر بھی ۔۔ غیب ۔۔ ہے۔ ہمارے ادھر بھی ۔۔ غیب ۔۔ ہے۔ اور بیچ میں ہماری ۔۔ حیات ۔۔ ہے۔

یاد رکھو! جب ہمارے محسن نے چاہا کہ جب ہم دنیا میں آئیں تو ہمیں آنا پڑا اور جب وہ کہے گا کہ واپس جاؤ۔ تو چاہے ہم نہ جانا چاہیں۔ ہمیں جانا پڑے گا۔ یہ اور بات کہ بعض لوگ اپنے پیروں سے چل کر نہیں جائیں گے تو چار بندے ہی اٹھا کے جائیں گے مگر جانا ضرور پڑے گا اور جب تک وہ یہاں رکھے گا ہمیں رہنا پڑے گا۔ اگر خود جانے کی کوشش کریں گے تو حکومت خودکشی کے جرم میں سزا دے گی۔ یا اللہ حرام موت میں پکڑے گا۔

بہر حال اللہ ہمیں جب تک رکھے گا۔ ہمیں رہنا پڑے گا اور جب بلائے گا ہمیں جانا پڑے گا۔ اور پھر لطف یہ ہے کہ ہم سے پوچھے بغیر ہی جب چاہا جہاں چاہا۔ جیسے چاہا بلا لیا۔ اور جس گھر میں چاہا بھیج دیا۔ چاہے امیر کے گھر میں۔ چاہے غریب کے گھر میں چاہے کسی کافر کے گھر میں۔ چاہے کسی مسلمان کے گھر میں۔ بہر حال وہ کسی سے مشورہ نہیں لیتا وہ بندے کو بھی دیکھتا ہے، اور گھر کو بھی دیکھتا ہے۔ جس کو جس گھر کے قابل سمجھتا ہے اس کو وہاں بھیج دیتا ہے۔ جسے دیکھتا ہے کہ یہ بندوں کے گھر کے قابل ہے اُسے بندے کے گھر بھیج دیا۔ اور جسے دیکھتا ہے کہ یہ اللہ کے گھر کے قابل ہے اُسے اللہ کے گھر بھیج دیا۔

بہر کیف ہمارا سب سے بڑا محسن ہمارا ۔ اللہ ۔ ہے۔ اس کے بعد دوسرا محسن وہ ہے جس نے ہمیں اللہ سے متعارف کروایا۔ ورنہ ہم کیا جانتے تھے کہ اللہ ہے

بھی یا نہیں ! ۔ ہم تو اپنی نادانی سے کئی لاکھوں چیزوں کو اللہ کہے بیٹھے تھے۔ لہٰذا آج ہم اس محسن اعظم کا شکریہ ادا کرتے ہیں جس نے ہمیں لاکھوں دروازوں سے ہٹا کر ایک باپ کریم کے دروازے پر بٹھا دیا۔ گویا ہم میں اتنی بے غیرتی اور بے حیائی تھی کہ در در جا کے بھیک مانگتے تھے۔ مگر اس محسن اعظم نے کہا ، نہیں ، ہر در پر بھٹکنے سے بہتر ہے کہ ایک باپ کریم پر بیٹھ جاؤ۔ لہٰذا آج ہم اس محسن اعظم کا شکریہ ادا کرتے ہیں جس نے ہمارا تعارف اللہ سے کروا دیا۔

سامعین !

بہت سے کم فہم حضرات ہماری تقاریر سن کے کہتے ہیں کہ شیعہ ، غلو کرتے ہیں کیونکہ یہ محمد و آل محمد کو اللہ سے ملا دیتے ہیں۔

میں کہتا ہوں ۔ ۔ نادانو ! ہم محمد و آل محمد کو اللہ سے کب ملاتے بلکہ محمد و آل محمد نے ہمیں اللہ سے ملا دیا ہے ۔ ورنہ ہم تو اللہ سے واقف ہی نہیں تھے اگر وہ درمیان میں نہ ہوتے ۔

حضور والا ! ایمان سے بتاؤ ، اگر محمد و آل محمد یہ کہہ دیتے کہ "ہم اللہ ہیں" تو کوئی طاقت اس کی تردید نہیں کر سکتی تھی ۔ یہ تو ان کی عالی ظرفی ہے کہ انہوں نے اللہ کو اللہ بنے دیا ۔ ورنہ ان کے اللہ بننے کی کوئی تردید نہیں کر سکتا تھا ۔ اور پھر لطف یہ ہے کہ باوجود ان کے انکار کرنے کے لوگ انہیں ۔ اللہ ، کہتے رہتے اور حیدرؑ کی انہیں اللہ کہتے تھے تو وہ خوش نہیں ہوتے تھے بلکہ انہیں قتل کرتے تھے کہ ہمیں اللہ مت کہو۔

بزرگان من !

اگر کوئی نہ مانے تو نہ مانے مگر اصل بات منہ سے نکل ہی پڑتی ہے کہ ، اے آل محمدؐ ! تم کتنے عالی ظرف ہو کہ تم اللہ جتنا بھی اپنی توہین سمجھتے ہو ۔ یہ توقع ہم عالی ظرف انسان

وکلوں کے بنانے سے اللہ نہ بنتا ہو۔ وہ لوگوں کے بنانے سے حاکم یا خلیفہ کیا بنے گا۔
گویا محمد مصطفٰے ہمارے محسن اعظم ہیں جنہوں نے ہمیں اللہ کا تعارف کروا دیا۔ ان کے
بعد زمانے میں ایسا انقلاب آیا کہ اللہ کا نام تو مٹا یا نہیں بلکہ محمدؐ کا نام بھی دنیا سے مٹنے لگا۔

اب بتاؤ! وہ ہمارا محسن اعظم ہے کہ نہیں جس نے خود مر کے محمدؐ کا نام نہ مٹنے
دیا۔ جس نے خود مٹ کر محمدؐ کا نام روشن کر دیا۔ وہ یقیناً ہمارا محسن اعظم ہے۔

لہٰذا بھائیو! تقاضائے فطرت یہی ہے اور شرافت یہی ہے کہ جس نے
احسان کیا ہو تو اس کے احسان کا بدلہ احسان میں اتارو۔ چاہے دنیا کچھ کہے مگر اپنے
محسن کے احسان کو نہ بھولنا۔ یہی شرافت ہے اور یہی انسانیت ہے کہ حسینؑ نے کربلا میں مرتے
ہو کر اللہ کے نام کو اور محمدؐ کے نام کو زندہ کر دیا۔ خدا کے نام کو حیات ابدی دے دی اور
محمدؐ کے نام کو حیات جاوید دے دی۔

خود ذبح ہو گیا مگر اپنے ان محسنوں کے نام کو زندہ رکھا

بہر نوع حسینؑ ہمارا محسن اعظم ہے جس نے ہم سب مسلمانوں پہ احسان فرمایا ہے
لہٰذا یہ بات شرافت کے خلاف ہو گی اور انسانیت کے منافی ہو گی کہ اگر حسینؑ جیسے
محسن کو بھلا دیا جائے۔ گویا حسینؑ کو بھلا دینا انسانیت کی توہین ہے۔

عزیزو!

مذہب کی الجھنوں اور بالا دستی سے بالاتر ہو کر حسینؑ جیسے محسن کے نام کو یاد رکھنا
ہی عین شرافت ہے۔ حسینؑ کے لئے کوئی مذہب وقت کی قید نہیں ہے۔ اگر مسلمان حسینؑ
کو امام کہتے ہیں تو لاکھوں ہندو بھی "ماتمِ حسینؑ" کہتے ہیں۔ گویا حسینؑ تمام
انسانیت کا محسن ہے۔ لہٰذا اللہ کا کوئی نام نہ لیتا اگر محمدؐ نہ ہوتے اور محمدؐ کا کوئی
نام نہ لیتا اگر حسینؑ نہ ہوتے۔ اور بات یہاں پر ختم نہیں ہوتی بلکہ حسینؑ کا کوئی نام نہ
لیتا اگر کوفہ و شام کے بازاروں میں زینبؑ خطبات نہ پڑھتی۔

یاد رکھو!

ایک ویرانے میں لٹ جانے والے قافلے کو کون جان سکتا تھا۔ اگر زینبؑ نہ ہوتی اس وقت نہ تو کوئی ریڈیو وغیرہ تھے اور نہ ہی کوئی اور ذرائع تھے مگر یہ صرف زینبؑ کا احسان ہے کہ اس نے حسینؑ کو متعارف کروا دیا۔ حالانکہ حکومت کا ذریعہ اشاعت نہ تھا اس لئے کہ حکومت تو خود قاتل تھی۔ اب کون آکر بتاتا کہ فلاں جنگل میں نہر کے کنارے ایک بے قصور قافلہ لٹ گیا ہے اگر کوفہ و شام کے بازاروں میں اونٹ کے منبر پہ بیٹھ کر ہاتھ گردن کے ساتھ بندھوا کر ننگے سر زینبؑ خطبات نہ پڑھتی۔ لہٰذا زینبؑ کا احسان ہے جس کی وجہ سے ہم حسینؑ سے متعارف ہوگئے۔ زینبؑ نے حسینؑ کو ایک ایک گھر پہنچایا ہے۔ ہر فرش حسینؑ کا ہم تک پہنچا زینبؑ کا احسان ہے۔ اور دنیا میں جتنی بھی مجالس برپا ہوتی ہیں ان تمام مجالس کی بانی زینبؑ ہے

سامعین!

ایک دن بہن بھائی کے درمیان گفتگو ہو گئی۔ اور زینبؑ نے کہہ دیا۔

• حسینؑ! جس باپ کا تو بیٹا ہے۔ اسی باپ کی میں بیٹی ہوں۔ جس ماں کا دودھ تو نے پیا ہے اسی ماں کا دودھ میں نے پیا ہے۔ جو تیرا نانا ہے وہی میرا نانا ہے اور جو تیرا بابا ہے وہی میرا بابا ہے۔

حسنؑ! تیرے سر پہ بابا کا عمامہ ہے مگر

دیکھ حسینؑ! میرے سر پہ ماں کی چادر ہے۔

لہٰذا حسینؑ! آج تیرا میرا مقابلہ ہے۔ اب بتا تو بتا کیا ہے!

حسینؑ نے فرمایا۔

• زینبؑ! آج میں اسلام کو بچانا چاہتا ہوں۔ آج میں مرکز ناناؐ کے دین کو بچانا چاہتا ہوں۔

زینبؑ نے کہا۔

۔ حسینؑ ! میں تجھے روکتی نہیں۔ جو تیرا ارادہ ہے پورا کر لے حسینؑ !

میرا تیرا بھی مقابلہ ہے۔ بے شک تو مر جا مگر

یاد رکھ حسینؑ ! میں زینبؑ تجھ سے وعدہ کرتی ہوں کہ میں بھی تیرے نام کو قیامت تک مرنے نہیں دوں گی۔ اگر بستی بستی، محلہ محلہ، گاؤں گاؤں جا کر حسینؑ حسینؑ نہ کہلوا دیا تو فاطمہؑ کی بیٹی نہ کہنا۔

میرے بھائیو ! زینبؑ کا احسان ہے کہ آج ہم اپنے تمام کاروبار چھوڑ کر محمدؐ کے حسینؑ کا پرسہ دے رہے ہیں اور زینبؑ کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

بی بی زینبؑ !

تیرا احسان ہے کہ تو نے حسینؑ جیسی قیمتی شے سے ہمیں متعارف کروا دیا۔ حسینؑ نے بھی کربلا میں بیٹے شہید کروائے اور تو نے بھی اپنے بیٹے شہید کروا دیئے۔

بی بی ! ہمیں معلوم ہے کہ دو بیٹے قربان کروا کے بھی حسینؑ کی نسل قیامت تک باقی رہے گی مگر واہ رے زینبؑ ! تو نے حسینؑ کی حفاظت میں اپنی پوری نسل ختم کروا دی۔

بی بی ! ہم تیرے ہر احسان کو سر آنکھوں پہ رکھتے ہیں اور تیرا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ تو نے آج حسینؑ جیسی قیمتی شے ہم تک پہنچا دی۔

میرے بھائیو !

زینبؑ نے پہلی مجلس گیارہ محرم سنہ ۶۱ھ کو حسینؑ کے لاشے پر پڑھی۔ پھر کوفہ کے بازاروں میں پڑھی۔ درباروں میں پڑھی۔ جب کوفے کے ایک ایک محلے میں پڑھ لی تو راستے کے شہروں اور قصبوں میں پڑھتی رہی۔ پھر شام کے ملک میں حسینؑ کی مجلسیں پڑھیں۔ یزید کے دربار میں پڑھیں۔ اور جب یزید نے کہا۔

۔ زینبؑ ! تم مدینے جا سکتی ہو۔

تو زینبؑ نے ایک مکان خالی کروا کے تین دن حسینؑ کی مجلس پڑھی۔ اور وہاں سے

جب مدینے کے لئے روانہ ہوئی تو راستے میں پڑھتی رہی، اور جب مدینے پہنچی تو پہلا کام یہ کیا، حسینؑ کی مجلس پڑھی۔

سامعین!

گزشتہ سال میں بھی مدینے کی زیارت سے فیض یاب ہوا ہوں۔ جب مکے سے مدینے کے لئے چلا تو خدا جانے میرے ذہن میں کیا کیا تصورات منڈلا رہے تھے۔ اور جب ہماری گاڑی مدینے کے قریب پہنچی تو ڈرائیور نے کہا۔

"مدینہ آگیا ہے"

میں نے دیکھا کہ دنیا خوشی منا رہی تھی اور لوگ ایک دوسرے سے بغل گیر ہو رہے تھے۔ مگر میں گاڑی سے نیچے اترا اور مدینہ کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا اور کہا۔

"مدینہ! تو ہی وہ مدینہ ہے نا جہاں حسینؑ رہتا تھا۔

اے مدینے کی گلیو!

تم گواہ ہو نا کہ تم میں حسینؑ کھیلا کرتا تھا۔

اے مدینے کے در و دیوار! تمہیں یاد ہے نا کہ یہاں حسینؑ اپنے نانا کے کندھے پہ بیٹھ کر چلا کرتا تھا۔

بہرطور زینبؑ نے مدینے میں حسینؑ کی پہلی مجلس پڑھی اور جب اہل مدینہ کو پتہ چلا کہ مدینے سے باہر حسینؑ کی بہن آئی ہے تو شہر کے سارے زن و مرد زینبؑ کا استقبال کے لئے آگئے، اور ان لوگوں کی قیادت حضرت ام البنینؑ فرما رہی تھیں۔

سامعین!

علامہ کفایت حسین مرحوم و مغفور اپنی مجلس میں ایک فقرہ کہا کرتے تھے کہ جب ام البنینؑ اہلبیتؑ کے قافلے کے قریب آئی ہیں تو پہلا شخص جو قافلہ زینبؑ میں سے جناب ام البنینؑ سے ملا وہ تھے حضور امام زین العابدین علیہ السلام۔

بائیس سال کا سن تھا۔ ایک سال کی قید مشقت کے آئے تھے۔ ام البنینؑ نے امام کو جو آتے دیکھا تو پہچانا نہیں۔ چنانچہ امام زین العابدینؑ نے آگے بڑھ کر سلام

کیا۔ دادی امّاں! سلام۔
ام البنین نے پوچھا ۔کون؟ ۔
امام نے جواب دیا ۔
۔امّاں! مجھے پہچانو ۔ میں زین العابدینؑ ہوں ۔
حافظ صاحب کہا کرتے تھے کہ امام کی یہ بات سن کر ام البنین کے منہ سے ساختہ نکلا ۔۔ بیٹا زین العابدین! جوانی کی اس عمر میں تم اتنے بوڑھے ہوگئے ۔
بیٹا! تمہاری داڑھی کیوں سفید ہوگئی؟
بیٹا! زینبؑ کہاں ہے ۔
زینبؑ نے قریب سے آواز دی ۔
۔ امّاں! میں یہاں کھڑی ہوں ۔
ام البنین آگے بڑھی ۔ زینبؑ کو سینے سے لگالیا ۔ اور کہا ۔
زینب بیٹا! کوئی ناراضگی ہے ۔؟
زینبؑ نے جواب دیا ۔
۔ مجھے ملتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے ۔ کیونکہ میں تیرے بچّوں کو چھوڑ کے آگئی ہوں ۔ میں تیری اولاد کو ختم کرکے آگئی ہوں ۔

صاحبان!

ایک چھوٹے بچّے نے ام البنینؑ کے پاؤں پکڑلیئے ۔
ام البنین پوچھتی ہیں ۔
بیٹا! تم کون ہو؟ ۔
بچّہ جواب میں کہتا ہے ۔
۔ امّاں! میں تیرے عباسؑ کا یتیم بیٹا ہوں ۔
عزادارِ سیّد الشہدا ء!
جب ساری گفتگو ہو چکی تو ام البنینؑ پوچھتی ہیں ۔

زینبؑ بتاؤ۔ کربلا میں کیا گذری ؟

چنانچہ زینبؑ فرماتی رہی۔ اماں جان! کیا سنتی ہو۔ میں دیکھتی رہی اور میرے بھائی بھتیجے۔ بیٹے اور اصحاب ذبح ہوتے رہے اور جب سنانے سناتے یہاں پہنچی کہ حسینؑ گھوڑے سے گرے تو ام البنینؑ گھبرا کے کہتی ہے۔

وائے۔ پھر کیا ہوا ؟

زینبؑ نے جواب دیا۔

اماں جان! پھر مجھے حسینؑ کی کوئی اطلاع نہ ملی۔ میں دروازہ پہ بے چین کھڑی رہی مگر کوئی بتانے والا نہیں تھا کہ میرا بھائی کہاں ہے ؟

ام البنینؑ نے پوچھا۔

زینبؑ! پھر کس نے اطلاع دی ؟

فرمایا۔

اماں! کوئی آدمی تو زندہ نہیں رہا تھا۔

زینبؑ نے فرمایا۔ اماں! مجھ پر احسان ہے حسینؑ کے گھوڑے کا جس نے مجھے آ کر بتایا کہ زینبؑ! تو یہاں کھڑی ہے اور حسینؑ گر گئے ؟

سامعین! بتاؤ۔ حسینؑ کا گھوڑا ہمارا محسن ہے کہ نہیں ؟
آج ہم اس محسن کی شبیہ کے قدموں پر سر رکھنا باعث سعادت سمجھتے ہیں اسکو سلام کرنا باعث عزت سمجھتے ہیں کیونکہ یہ ہمارے محسن اعظم گھوڑے کی شبیہ ہے۔

خداوند عالم بصدقہ محمدؐ و آل محمدؐ ہماری
مجلس کو قبول و منظور فرمائے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ
اللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّآلِ مُحَمَّدٍ

ناشر: مُعلّم پبلشنگ کمپنی، اُردو بازار، لاہور